رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۶۰۷

ہندوستانی خریداروں کے لیے ارسال زر کا پتہ
مینجر "الفرقان" کچہری روڈ لکھنؤ

☆

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۳ | بابت ماہ جولائی ۱۹۶۰ء مطابق ذوالحجہ و محرم ۷۹-۱۳۸۰ھ | عدد ۱

تذکرہ و تبصرہ ——— امین احسن اصلاحی ——— ۲

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ ——— " ——— ۹

مطالعہ حدیث

معازف و مزامیر کا شرعی حکم ——— مولانا عبدالغفار حسن صاحب ——— ۲۲

مقالات

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب ——— ضیاء الدین صاحب اصلاحی ——— ۳۲

اجتماعیات و سیاسیات

اسلامی قومیت کے عوامل ——— امین احسن اصلاحی ——— ۴۱

تقریظ و تنقید

مقالات سیرت ——— اسحاق النحو ——— ۵۳

ین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ میثاق ۱۱۔ احمد سٹریٹ رحمانپورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

تذکرہ و تبصرہ

جون کا پورا مہینہ تقریباً میرالبسترِ علالت پر گذرا۔ پچھلے پرچے کی ترتیب سے فارغ ہوتے ہی مجھے انفلوئنزا اور ملیریا کا کچھ ملا جلا سا بخار ہو گیا۔ یہ بخار کم و بیش اٹھارہ دنوں تک رہا جس نے مجھے بہت کمزور کر دیا۔ اب اگرچہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ سے بخار سے نجات پا چکا ہوں لیکن شاید یہ لاہور کی سخت گرمی کا اثر ہے کہ اب تک کوئی کام کرنے کے قابل نہیں ہو سکا۔ یہ سطریں بھی بستر سے لیٹے لیٹے ایک رفیق کو املا کرا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس بیماری کو گناہوں کا کفارہ بنائے اور جو فرصتِ حیات باقی ہے اس کو اپنی پسند کے کاموں میں صرف کرنے کی توفیق بخشے۔

میری اس بیماری سے قدرتی طور پر سب سے زیادہ متاثر میثاق ہوا۔ میں نے سال بھر بڑی محنت کر کے پابندیٔ وقت کی ایک روایت قائم کی تھی جو افسوس ہے میری اس بیماری کے سبب سے باقی نہ رہ سکی۔ عموماً میثاق ہر ماہ کی پانچ تک شائع ہو جاتا تھا لیکن اس ماہ کا پرچہ غیر معمولی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے جس سے اس کے قارئین کو لازماً بڑی شکایت ہوگی۔ لیکن اپنی مجبوریوں کے پیشِ نظر اس کو بسا غنیمت سمجھتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح یہ پرچہ شائع ہو گیا، ناغہ ہونے نہیں پایا۔ خدا کرے یہ تاخیر مزید متعدی نہ ہو اور جلد سے جلد ایسے حالات

پیدا ہو جائیں کہ پرچہ اپنے معمول کے مطابق وقت پر شائع ہو جایا کرے۔

اس پرچے میں جو مضامین دیئے جا رہے ہیں، نہ میں ان کی ترتیب میں حصہ لے سکا ہوں اور نہ ان پر نظر ڈال سکا ہوں۔ ممکن ہے اس کمی کے سبب سے قارئین مضامین کی ترتیب میں کوئی خامی یا خلا محسوس کریں۔ خاص طور پر تدبرِ قرآن کا جو حصہ اس نمبر میں دیا جا رہا ہے اس پر مجھے نظر ڈالنے کا بالکل موقع نہیں مل سکا ہے، حالانکہ تفسیر کی ہر قسط میں ہمیشہ کئی بار نظر ڈالنے کے بعد پرچہ میں دینے کا اہتمام کرتا رہا ہوں۔ اگر قارئین اس کے کسی حصے میں کوئی غلطی محسوس کریں تو میں امید کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس سے آگاہ فرما دیں گے تاکہ آئندہ پرچے میں اس کی اصلاح کی جاسکے۔ یہ سارا پرچہ برادرم خالد مسعود صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اگر انھوں نے ٹھیک مرتب کیا ہے تو اس کی داد کے حقدار وہی ہیں۔ اور اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی تو اس کی ذمہ داری مجھ پر اور میری اس بیماری پر ہے۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر صرف یہ چیز رہی ہے کہ پرچہ کسی نہ کسی طرح چھپ کر قدردانوں تک پہنچ جائے تاکہ اس کی تاریخ میں یہ ناغے کا حادثہ پیش نہ آنے پائے۔

—— (۲) ——

ایک عزیز دوست نے اپنے گرامی نامہ میں یہ شکوہ کیا ہے کہ لاہور کے علماء کی ایک جماعت کی طرف سے آئین کمیشن کے سوالنامے کا جو جواب شائع ہوا ہے، اس پر میں نے صرف ضد اور انانیت کے سبب سے دستخط نہیں کیے۔ اگر ضد اور انانیت کا سوال نہ ہوتا تو میں اس جواب پر ضرور دستخط کر دیتا۔ میں اپنے نفس کو برائیوں اور کمزوریوں سے پاک قرار نہیں دیتا۔ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ، لیکن اس معاملے میں میں اپنے نفس کا پوری احتیاط کے ساتھ جائزہ لینے کے بعد اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اس میں ضد اور انانیت کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ صرف دیانت دارانہ اختلافِ رائے کو دخل ہے۔ میں ایمان داری کے ساتھ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس جواب کے اکثر حصہ سے چونکہ میں اتفاق نہیں کر سکتا اس وجہ سے مجھے اپنا جواب الگ بھیجنا چاہیے۔ اوّل تو یہی بات بڑی معیوب ہے کہ اگر کسی شخص سے کسی ایک معاملے میں مجھے اختلاف ہو تو میں اس کی ہر بات سے، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط، اختلاف کرنے کی بیماری میں مبتلا ہو جاؤں، اس بیماری میں کوئی شامت زدہ آدمی ہی مبتلا ہو سکتا ہے، جس شخص میں معقولیت کا ذرا بھی شائبہ ہوگا وہ خدا سے اتنا

حکومت کا حوالہ دیا ہے۔ ان باتوں سے ہم اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس ملک کی اجتماعی زندگی کی تشکیل میں اسلام کو وہی اہمیت وہ بھی دینا چاہتے ہیں جو اس کو ہم دینا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے اسلام سے متعلق ہمارے اور ان کے عقیدہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اختلاف جو کچھ ہے وہ عملی مسائل میں اسلام کی تطبیق کے بارے میں ہے اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہ اختلاف بہت نمایاں اور بیّن ہے۔ یہ اتنا نمایاں اور بین ہے کہ بعض اوقات یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید ہمارے اور ان کے مابین نظریہ کا اختلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختلاف بڑے دور رس نتائج رکھتا ہے۔ اس کے سبب سے ذہنوں اور دماغوں کے اندر ایک کشمکش پائی جاتی ہے جس کا دور ہونا حکومت عوام اور ملک کے دینی طبقات کی یکجہتی کے لیے ضروری ہے۔ جو لوگ اس کشمکش کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہم ان کے خیال سے اتفاق نہیں کرتے، ہمارے نزدیک اس کی بڑی اہمیت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ جتنی توجہ حکومت نے اس ملک کے دوسرے اہم مسائل کی طرف کی ہے اس سے کہیں زیادہ توجہ کا مستحق یہ مسئلہ ہے۔ اسی کے حل سے اس ملک کو حقیقی استحکام حاصل ہوگا، اسی سے یہ ملک صحیح معنوں میں ایک اسلامی ملک بنے گا اور ہمارے نزدیک کمیونزم کے سیلاب کو بھی اگر کوئی چیز روک سکے گی تو یہی چیز روک سکے گی۔ کمیونزم نے اپنی جو شکل اب جاپان میں دکھائی ہے اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ مضبوط ایمان کے بغیر کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

لیکن اس کشمکش کو دور کرنے کی شکل کیا ہے؟ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ کی ترقی اور حالات کی تبدیلی سے یہ کشمکش آپ سے آپ دور ہو جائے گی، لیکن ہم اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے۔ اسلام کوئی وہم نہیں ہے کہ مزعومہ ترقیوں کی روشنی اس وہم کو دور کر دے گی۔ اسی طرح ہم ان لوگوں کے خیال سے بھی اتفاق نہیں کرتے جو ثقافت اسلامیہ وغیرہ جیسے اداروں کے تو تصنیف مذہب سے لو لگائے بیٹھے ہیں کہ قدیم و جدید کے درمیان کی اس خلیج اختلاف کو وہ پاٹ سکے گا۔ اس قسم کے اداروں کی کوششیں کچھ...

خام قسم کے نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شکوک میں ضرور مبتلا کر دیں گی لیکن اصل مسئلہ جوں کا توں رہے گا۔ طاقت کے استعمال کا ظاہر ہے کہ اس طرح کے معاملات میں کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، دنیا کے تجربات گواہ ہیں کہ طاقت ذہنوں اور دلوں کی تبدیلی کے لیے سب سے زیادہ کمزور ہتھیار ہے۔

ہمارے نزدیک اس مسئلہ کا اگر کوئی صحیح حل ہے تو یہ ہے کہ ہماری حکومت کے ذمہ دار حضرات کوئی ایسی مناسب شکل اختیار کریں جس سے ایک مرتبہ اس ملک کے قابل اعتماد علما سے انھیں براہ راست تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ان مسائل پر تبادلہ خیالات کا موقع ملے جن کے بارے میں ان کا اور دینی طبقات کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے الگ الگ ہے۔ یہ مسائل تعداد میں زیادہ نہیں ہیں لیکن ایک ذہنی کشمکش کا باعث ہیں اور کشمکش ہی کو ان کے حل کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے یہ بہتر ہوگا، کہ تفہیم و تفاہم کو ان کے حل کا ذریعہ بنایا جائے۔

یہ بات ہم اس حسن ظن کی بنا پر کہہ رہے ہیں کہ ہمارے نزدیک اسلام کے بارے میں حکومت اور مذہبی طبقات کے درمیان جو فرق ہے وہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا عقیدہ کا نہیں ہے بلکہ عملی زندگی میں اس کے انطباق کا ہے۔ اسی طرح ہم اس معاملہ میں نیت اور ارادہ کا بھی کوئی فساد نہیں محسوس کرتے۔ بلکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ چونکہ دونوں طبقات کی تعلیم و تربیت الگ الگ طریقوں پر ہوئی ہے اس وجہ سے دونوں کا زاویہ نگاہ مختلف مسائل میں الگ الگ ہو گیا ہے۔ ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ یہ اختلاف کوئی معمولی اختلاف نہیں ہے جس کو آسانی سے دور کیا جا سکے لیکن جہاں مذہب کے بارے میں اصولی طور پر اتفاق رائے موجود ہو اور نیتوں میں کوئی فساد موجود نہ ہو وہاں تفہیم و تفاہم کی کامیابی کے بڑے امکانات ہیں، بشرطیکہ یہ حقیقت ہر ایک پر واضح ہو کہ کشمکش کی راہ نہ ملک کے لیے مفید ہے، نہ مذہب کے لیے، نہ حکومت کے لیے نہ جمہور کے لیے۔ علاوہ ازیں مذہب کے ترجمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ جن مسائل کا تعلق براہ راست اسلام سے نہیں ہے ان کو وہ اپنی فہرست میں

شامل کرنے کی کوشش نہ کریں ورنہ اس سے بلاوجہ بدگمانیاں پیدا ہوں گی۔

---

(۴)

یہ پرچہ میثاق کے دوسرے سال اور اس کی تیسری جلد کا پہلا پرچہ ہے۔ اگرچہ اس کا آغاز میری بیماری سے ہوا ہے لیکن اس نئے سال میں رسالے کی ترتیب میں چند تبدیلیاں کرنا چاہتا ہوں۔ ان تبدیلیوں سے رسالے کی افادیت میں اضافہ ہو جائے گا اور اس کے قارئین انشاء اللہ ان کو پسند کریں گے۔

۱۔ سب سے مقدم تبدیلی تو یہ پیش نظر ہے کہ اب اس میں تفسیر کے صفحات کچھ زیادہ کر دیئے جائیں گے۔ میثاق کے بہت سے قارئین عرصے سے اس بات کی شکایت کر رہے تھے کہ تفسیر کے صفحات کم ہوتے ہیں۔ بعض مخدوم دوستوں کی تو یہ خواہش ہے کہ پورا رسالہ تدبر قرآن ہی پر مشتمل ہو تو یہ بات عین ان کی مرضی کے مطابق ہوگی لیکن ان قدردانوں کی اس خواہش کے باوجود اب تک تفسیر کے صفحات میں کوئی اضافہ اس وجہ سے نہیں کیا جا سکا کہ تفسیر کے یہ چند صفحات لکھنے کے لیے مجھے کافی مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور اس مشقت میں مزید کوئی اضافہ فی الحال ممکن نہیں تھا۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے میثاق کو بعض دوسرے اہل قلم کا تعاون بھی حاصل ہو گیا ہے جس کے سبب سے اب میرے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ تفسیر کی تسوید و تحریر کے لیے کچھ زیادہ وقت دے سکوں۔ چنانچہ اب میں نے یہ ۔۔ فیصلہ کر لیا ہے کہ صحت بحال ہونے پر تفسیر کے صفحات کم از کم بارہ کر دیئے جائیں گے۔

۲۔ خدا نے چاہا تو اس نئے سال میں مولانا فراہی کے افادات کے باب کا بھی اضافہ کر دیا جائے گا۔ مولانا کے معارف کے قدرداں اس کے لیے بار بار تقاضا کر رہے ہیں لیکن میں اس وجہ سے ہمت نہیں کر رہا تھا کہ اگر اس باب کا بھی اضافہ ہو گیا تو دوسرے ابواب کی طرح اس کے لیے بھی مجھ ہی کو وقت نکالنا پڑے گا لیکن اب خدا نے چاہا تو ایسی شکل نکل آئے گی کہ ہر اشاعت میں مولانا کی کوئی نہ کوئی خاص چیز قارئین تک پہنچتی رہے گی۔

میثاق کی اس اشاعت میں آئین کمیشن کے سوالنامہ کے بقیہ جوابات شائع کرنے کا ارادہ تھا لیکن چونکہ وہ جوابات ہفت روزہ 'المنبر' لائلپور میں شائع ہو چکے ہیں اس لیے میثاق میں ان کی اشاعت کا خیال ترک کر دیا گیا ہے۔

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورہ بقرہ

(۱۲)

۲۹۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

یٰبنی اسرآءیل اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ یہودی علماء اس کے معنی جنگل اللہ کے بتاتے ہیں۔ یہ معنی لینے میں غالباً اس روایت کو بڑا دخل ہوگا جو یہود نے تورات میں حضرت یعقوبؑ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کشتی لڑنے کی داخل کر رکھی ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے۔ ان کی تحقیق میں یہ لفظ دو جزوں سے مرکب ہے۔ اسرا اور ایل۔ اسرا کے معنی ان کی تحقیق میں بندہ کے ہیں اور ایل عبرانی میں الٰہ کے معنی کے لیے مشہور ہی ہے۔ اس طرح مولانا کے نزدیک اسرائیل کے معنی عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ، کے ہوئے۔

یہود نے اسرائیل کی وجہ تسمیہ معین کرنے میں جس قسم کی ذہانت دکھائی ہے اسی قسم کی ذہانت انھوں نے یعقوبؑ کی وجہ تسمیہ معین کرنے میں بھی دکھائی ہے۔ ان کے نزدیک یعقوبؑ کا نام یعقوب اس لیے ہوا کہ وہ اپنے بھائی عیسو کی ایڑیاں پکڑے ہوئے پیدا ہوئے۔ استاذ امامؒ کے نزدیک اس کی توجیہ بھی یہود کی توجیہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ قرآن مجید کے اشارات کی روشنی میں حضرت یعقوبؑ کے یعقوبؑ نام پانے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسحٰق کے بعد ان کے پیدا ہونے کی بشارت بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سنا دی تھی۔

اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم | اذکروا، یاد کرو۔ یہ بنی اسرائیل کو دعوت باندازِ ملامت ہے یعنی یاد کرو اس لیے کہ تم بالکل بھول بیٹھے ہو اور جو فضل میں نے تم پر کیے تھے ان کو تم نے اپنے استحقاق ذاتی و خاندانی کا ثمرہ سمجھ لیا۔

نعمت سے یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے جن افضال و عنایات کی طرف اشارہ فرمایا ہے، قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کی تفصیل بھی فرما دی ہے۔ ہم چند آیتیں یہاں نقل کرتے ہیں، ان سے اس اجمال کی وضاحت ہو جائے گی۔

اسی سورہ کے آگے والے رکوع میں فرمایا ہے :-

يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۴۷ - بقرہ)

اے بنی اسرائیل میرے اس انعام کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور میں نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔

اس آیت میں اس انعام کا حوالہ دیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سیادت و امامت کی صورت میں عطا فرمایا تھا۔

پھر سورہ مائدہ میں فرمایا ہے :

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِىْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ (۷ - مائدہ)

اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کے انعام کو اور اس کے اس عہد کو جو اس نے تمہارے ساتھ ٹھہرایا۔

اس آیت میں اس انعام کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ان کو اپنی شریعت دے کر فرمایا۔ یہ شریعت اللہ تعالیٰ کے درمیان اور ان کے درمیان ایک میثاق اور معاہدے کی حیثیت رکھتی تھی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی شریعت کی پابندی کا عہد لیا اور اس پابندی کے صلہ میں اپنی طرف سے ان کے لیے دنیا و آخرت کی فوز و فلاح کی ضمانت دی۔

پھر اسی مائدہ میں آگے چل کر اس انعام کی مزید وضاحت ان لفظوں میں فرمائی ہے :-

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم کے لوگو، اپنے اوپر اللہ کے انعام کو یاد رکھو کہ اس نے تمہارے اندر انبیاء اٹھائے، تم ہی بادشاہ بنائے اور تم کو

مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۰ مائدہ)

وہ کچھ بخشا جو تم سے پہلے دنیا میں کسی قوم کو نہیں دیا۔

ان آیات سے اس اجمال کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے جو زیر بحث آیت میں ہے۔ مزید جو چیز اس آیت میں پیش نظر رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اول تو فرمایا کہ میرا انعام اور پھر اس پر مزید اضافہ یہ فرمایا کہ جو میں نے تم پر انعام کیا' یہ تاکید اس لیے ہے کہ بنی اسرائیل کی تمام گمراہیوں کی جڑ جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، یہی چیز تھی کہ ان کو جو بڑائیاں محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوئیں ان کو انھوں نے اپنی اہلیت و استحقاق کا کرشمہ اور اپنے نسل و نسب کا ایک قدرتی حق سمجھ لیا۔ یہاں نعمتی اور انعمت علیکم کے الفاظ سے ان کی اسی ذہنیت کی اصلاح مقصود ہے اور آگے یہ چیز بالتدریج کھلتی جائے گی۔

واوفوا بعهدی اوف بعهدکم | عہد سے مراد یوں تو پوری شریعت ہی ہے اس لیے کہ شریعت درحقیقت بندوں اور خدا کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ معاہدہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام آسمان و زمین کا خالق و مالک ہے، کسی کی بھی یہ شان نہیں ہے کہ تمام آسمان و زمین کا بادشاہ اس سے کوئی معاہدہ کرے، اس کے باوجود اگر وہ کسی کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی طرف سے اس کو ایک بہت بڑا شرف بخشتا ہے لیکن یہاں اس عام معاہدہ کے ساتھ ساتھ اس خاص عہد کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق لیا گیا تھا۔ اس عہد کا ذکر تورات میں بھی ہے اور اس کی طرف قرآن میں بھی اشارات کیے گئے ہیں۔ کتاب استثنا ۱۵ - ۱۹ میں ہے :-

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا ...... میں ان کے لیے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔

قرآن مجید میں اس عہد کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے

رحمت کی جو دعا کی ، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :۔

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

۱۵۶ - ۱۵۷ اعراف۔

اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے ۔ میں اس کو لکھ رکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں گے ، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے ۔۔۔ یعنی جو پیروی کرتے ہیں رسول نبی امی کی جن کو لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں ۔ وہ ان کو حکم دیتے ہیں نیکی کا اور روکتے ہیں منکر سے اور ان کے لیے جائز کرتے ہیں پاکیزہ چیزیں اور حرام کرتے ہیں ان پر ناپاک چیزیں اور دفع کرتے ہیں ان پر سے بوجھ اور پھندے جو ان پر تھے ۔ پس جو ان پر ایمان لائے اور جنھوں نے ان کی حمایت کی اور مدد دی اور اس روشنی کی پیروی کی جو ان کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ۔

•

اس آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بنی اسرائیل سے جو عہد اللہ تعالیٰ نے لیا تھا اس میں بنی اسرائیل پر کیا ذمہ داری ڈالی گئی تھی اور اس ذمہ داری کے ادا کرنے کے صلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے کیا وعدے کیے گئے تھے ۔

وایای فارھبون | کسی کی عظمت وجلالت کے تصور سے دل پر جو لرزش اور کپکپی کی حالت طاری ہو جاتی ہے اس کے لیے عربی زبان میں رہبت کا لفظ ہے ۔ اور یہ بات ایاک نعبد کی تفسیر کرتے ہوئے ہم واضح کر چکے ہیں کہ اگر فعل کے مفعول یا اس کے متعلق کو فعل پر مقدم کر دیا جائے تو یہ اس کے اہتمام اور اس پر زور دینے کی ایک شکل ہوتی ہے ۔ علاوہ بریں اگر فعل پر ف آ جائے تو یہ مزید اہتمام کی ایک دلیل ہے ۔ علیٰ ہذا القیاس اگر فعل کے بعد ضمیر بھی آ جائے تو اس پہلو کی مزید وضاحت ہو گی ۔ اس لحاظ سے وایای فارھبون کے

معنی ہوں گے ، پس صرف مجھی سے ڈرو ۔

صرف مجھی سے ڈرو کا مطلب یہاں یہ ہے کہ میرے عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے میں تمہاری دوسری مصلحتوں اور دوسرے اندیشوں پر میری عظمت وجلالت کے تصور کو غالب ہونا چاہیے ۔ تم ڈرتے ہو کہ اگر تم نے نبی آخر الزماں کی دعوت قبول کر لی تو تمہاری سیادت و ریاست ختم ہو جائے گی ، امیوں کو تم پر فضیلت حاصل ہو جائے گی ۔ تمہارے عوام تمہارے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور جو فوائد تم ان سے اب تک حاصل کرتے رہے ہو ان کے دروازے بند ہو جائیں گے حالانکہ ڈرنے کی چیزیں یہ نہیں ہیں ، ڈرنا تو صرف مجھ سے چاہیے جس کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے اور جس نے تم سے عہد لیتے وقت پہاڑ کو تمہارے سروں پر چھتری کی طرح اوڑھا دیا تھا ۔

وآمنوا بما انزلت مصدقا لما معکم | اس چیز کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے ۔ یعنی قرآن مجید اس پیشنگوئی کو بھی ثابت کر رہا ہے جو تورات میں آخری نبی کی بعثت اور اس بعثت کی خصوصیات سے متعلق وارد تھی ۔ مقصود یہ ہے کہ اگر سمجھ سے کام لو تو قرآن مجید اور یہ پیغمبر تمہارے لیے چڑنے کی چیز نہیں ہیں بلکہ سر اور آنکھوں پر بٹھانے کی چیز ہیں کیونکہ ان کے ظہور سے سب سے زیادہ تمہارا ہی سر بلند ہوا ہے ۔ تمہارے صحیفوں میں ان کی پیشین گوئیاں موجود تھیں اور یہ پیشین گوئیاں اب تک اپنے حقیقی مصداق کے ظہور کی منتظر تھیں ۔ اب اس کتاب اور اس پیغمبر کے ظہور نے ان کا مصداق دنیا کے سامنے پیش کر کے تمہاری کتاب کو سند تصدیق عطا کر دی تو تمہیں تو سب سے پہلے اس پر ایمان لانے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے ۔

اس تصدیق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جہاں تک تورات یا انجیل کے آسمانی صحیفے ہونے کا تعلق ہے قرآن مجید آشکارا طور پر ان کے آسمانی ہونے کی تصدیق کرتا ہے ، ان کے لانے والوں کی نبوت و رسالت کی بھی نہایت غیر مبہم الفاظ میں تصدیق کرتا ہے ، ان کی تعلیمات کی بھی اصولی طور پر تصدیق کرتا ہے ، قرآن اگر تردید کرتا ہے تو صرف ان چیزوں کی تردید کرتا ہے جو غلط طریقوں سے ان صحیفوں میں شامل کر دی گئی ہیں یا تحریف کر کے جن کی اصل شکل بگاڑ دی گئی ہے ۔ اس طرح غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ جہاں تک اصل تورات کا تعلق ہے قرآن مجید اس کی سچائی کا گواہ بن کر نازل ہوا ہے ، وہ اس کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان چیزوں سے اس کو بری قرار دیتا ہے جو اس کو

جھٹلانے والی ہیں۔

ولا تکونوا اول کافر بہ | "افعل" کا مضاف الیہ اگر نکرہ مفرد ہو تو وہ تمیز کے مفہوم میں ہوا کرتا ہے لیکن اگر اس کی اضافت معرفہ کی طرف ہو تو اس شکل میں مضاف الیہ جمع ہوگا۔ مثلاً قل ان کان للرحمٰن ولد فانا اول العابدین (۸۱۔ زخرف) (کہہ دو، اگر خدا کے کوئی اولاد ہو تو میں سب سے پہلا عبادت کرنے والا ہوں)

اول کافر اور اول الکافرین دونوں کے مواقع استعمال ہیں، استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ایک لطیف فرق بتاتے ہیں۔ جب اول کافر کا استعمال ہوگا تو اس میں اس سے بحث نہیں ہوگی کہ اس کے علاوہ کوئی اور کافر پایا جاتا ہے یا نہیں اور دوسری شکل میں مفہوم یہ ہوگا کہ وہ کفر کرنے والوں میں سب سے پہلا شخص ہے۔

"کفر" کا لفظ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں حق کے انکار کے معنی میں بھی آتا ہے اور کفران نعمت کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ یہاں یہ لفظ دونوں ہی مفہوموں پر حاوی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن پر ایمان لانے کا ان سے عہد لیا جا چکا تھا اس وجہ سے اس کا حق ہونا ان پر اچھی طرح واضح تھا، اس بنا پر یہ ایک عظیم حق کا انکار ہوا۔ پھر قرآن مجید ان کے لیے ایک بہت بڑی نعمت بن کر نازل ہوا تھا، اس پر ایمان لانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے ابدی نعمتوں کے وعدے تھے، اس وجہ سے اس سے اعراض درحقیقت ایک بہت بڑا کفران نعمت بھی تھا۔

سب سے پہلے اس کے کفر کرنے والے نہ بنو، کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب دوسرے کفر کرلیں تو تمہارے لیے کفر کرنا جائز ہو جائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ قرآن تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہوا نازل ہوا ہے اور اس پر ایمان لانے کا تم سے اس کے نزول سے پہلے ہی عہد لیا جا چکا ہے اس وجہ سے اس کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کی سب سے پہلے تم ہی سے توقع کی جا سکتی تھی لیکن یہ عجیب صورت حال ہے کہ دوسرے تو اس سے نا آشنا ہونے کے باوجود اس پر ایمان لانے کے لیے سبقت کریں اور تم اس سے پہلے سے آشنا ہو کر اس کی مخالفت کی راہ میں سبقت کرو۔

اس طرح کے مواقع پر نہی کے ساتھ جو قید لگی ہوئی ہوتی ہے استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

کے نزدیک اس کا مقصود محض صورت واقعہ کے گھنونے پن کو ظاہر کرنا ہوتا ہے، نہی کا اصل تعلق تو فعل سے ہوتا ہے، قید اس کے ساتھ محض اس لیے بڑھا دی جاتی ہے تاکہ وہ صورت حال سامنے آجائے جو اس کے ارتکاب میں مضمر ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

لَا تَاكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (۱۳۰۔ آل عمران) سود نہ کھاؤ، دگنا چوگنا کرتے ہوئے

اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر سود در سود کی شکل پیدا نہ ہو تو سود مباح ہے بلکہ مقصود اس صورت حال کے پیش کرنے سے اصل فعل کی نفرت انگیز شکل کو سامنے کر دینا ہے۔

اسی طرح زیر بحث ٹکڑے کے بعد فرمایا، وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (اور میری آیتوں کو حقیر پونجی کے عوض نہ بیچو) تو اس کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ اگر اچھے دام مل جائیں تو بیچ سکتے ہو، بلکہ نہی کا تعلق تو یہاں بھی اصل فعل سے ہے، یعنی روکا جس چیز سے گیا ہے وہ دین فروشی ہے، لیکن ثمناً قلیلاً کی قید نے یہ حقیقت بھی واضح کردی کہ دین فروشی کا یہ کاروبار نہایت ذلیل طریقہ سے ہو رہا ہے کیونکہ اللہ کی آیات کے بدلے میں اگر تمام دنیا بھی حاصل ہو جائے تو وہ بہرحال ایک متاع حقیر ہی ہے۔

ممکن ہے یہاں بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ قرآن کے انکار میں یہود سے پہلے تو قریش نے سبقت کی تو قرآن نے سبقت کا الزام یہود پر کیوں عاید کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات یہاں یہود سے بحیثیت قوم کے کہی جا رہی ہے اور مقابل میں یہاں امی عرب بحیثیت قوم کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ عدنانی ہیں یا قحطانی۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ قریش نے قرآن کا انکار کرنے میں سبقت کی لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انصار نے اس کے قبول کرنے میں سبقت کی۔ پھر قریش کے انکار کی نوعیت بھی بہرحال یہ نہیں تھی کہ سارا قریش اس کے انکار ہی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہو، ان میں قرآن کے انکار کرنے والے بھی تھے اور قرآن پر جان نثار کرنے والے بھی، لیکن بنی اسرائیل کا حال اس سے بالکل مختلف تھا، یہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور مخالفت کے لیے من حیث القوم اٹھ کھڑے ہوئے اور آخر دم تک اس مخالفت پر اڑے رہے۔ درآنحالیکہ دین الٰہی کے وارث اور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں کے امین ہونے کے سبب سے امی عربوں کے مقابل میں ان کو اول المومنین کا

درجہ حاصل کرنا تھا۔

ولا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا | میری آیات کو حقیر قیمت کے عوض نہ بیچو، یعنی اپنے دنیوی مفادات و مصالح پر تورات اور اس کے احکام و ہدایات کو قربان نہ کردو۔ یہ ایک جامع اسلوب بیان ہے جس میں یہود کی ان تمام عہد شکنیوں کی طرف اشارہ ہوگیا ہے جن کے وہ مرتکب ہوئے تھے اور جن کی تفصیل اسی سورہ میں آگے آرہی ہے۔ یہود سے اللہ تعالیٰ نے جو عہد لیا تھا اس میں تین چیزیں خاص طور پر بہت نمایاں تھیں، ایک یہ کہ وہ تورات کی شریعت پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں گے، دوسری یہ کہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے جو ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتا ہوا نازل ہوگا، جو تورات میں موجود ہیں، تیسری یہ کہ ان کو جو کتاب عطا ہوئی ہے خلق کے سامنے اس کی شہادت دیں گے، اس کے کسی جزو کو چھپائیں گے نہیں۔

یہاں جب فرمایا کہ میری آیتوں کو حقیر معاوضے کے عوض نہ بیچو تو دوسرے الفاظ میں گویا یہ فرمایا کہ اپنے دنیوی مفادات کی خاطر اُن تمام عہود کو خاک میں نہ ملاؤ جو تم خدا سے کرچکے ہو۔

نقض عہد کے مفہوم کو تعبیر کرنے کے لیے قرآن مجید نے یہ اسلوب دوسرے مقامات میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہے:-

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ
يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ
هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا
مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ
فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا
بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا
أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ
(۴۴ - مائدہ)

ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے رہے وہ انبیا جنھوں نے خدا کی فرمانبرداری کی اور ربیوں اور علماء نے بھی اسی کے مطابق فیصلے کیے کیونکہ وہ کتاب الٰہی کے امین بنائے گئے تھے اور اس کے گواہ ٹھہرائے گئے تھے تو تم لوگوں سے نہ ڈرو، صرف مجھی سے ڈرو۔ اور میری آیات کو حقیر قیمت کے عوض نہ بیچو۔ اور جس نے اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کیا تو وہی لوگ کافر ہیں۔

اس آیت میں لَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا کے موقع و محل کو دیکھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے دنیوی مفادات کی خاطر اللہ کے عہد کو، جو اس نے تورات میں تم سے لیا ہے نہ توڑو۔ یہ مفادات تمہاری نگاہوں میں کتنی ہی اہمیت رکھنے والے ہوں لیکن خدا کے عہد و پیمان اور اس کے احکام و آیات کے بالمقابل بالکل ہی ہیچ ہیں۔

اس ٹکڑے کے مخاطب یہود کے عوام بھی ہیں اور خواص بھی۔ عوام اس وجہ سے کہ وہ بظاہر اگرچہ تورات کو مانتے تھے لیکن ان کی ساری دینداری محض رسمی و رواجی تھی، اصل شریعت انھوں نے اپنی خواہشات نفس پر قربان کردی تھی۔ خواص اس وجہ سے کہ ان کے صحیفوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید سے متعلق جو پیشین گوئیاں تھیں انھوں نے ان پر یا تو تاویل کے پردے ڈال دیے تھے یا ان پر تحریف کی قینچی چلا دی تھی، اور محرک اس تاویل و تحریف کی دو چیزیں تھیں۔ ایک بنی اسمٰعیل کے خلاف حسد کا جذبہ، دوسری اس بات کا خوف کہ اگر اصل حقیقت ظاہر کردی تو عوام بگڑ کھڑے ہوں گے اور جو عزت و سرداری اس وقت ان کو حاصل ہے وہ خطرے میں پڑ جائے گی۔

وایای فاتقون | اتقا اور تقویٰ کی تحقیق ہم ھدی للمتقین کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کرچکے ہیں۔ اوپر والی آیت میں وایای فارھبون فرمایا تھا۔ یہاں وایای فاتقون فرمایا۔ پھر آگے کی ایک آیت میں خشوع کا لفظ آرہا ہے۔ رہبت، تقویٰ، خشوع سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ کسی کے عظمت و جلال کے تصور سے دل پر جو لرزش اور کپکپی طاری ہوتی ہے وہ رہبت ہے۔ اس لرزش و کپکپی سے صاحب عظمت و جلال کے لیے دل میں جو عجز و فروتنی اور پستی و نیازمندی کی حالت پیدا ہوتی ہے اور طبیعت میں بے نیازی کی جگہ فقر کا اور گھمنڈ کی جگہ اخبات کا جو احساس ابھرتا ہے وہ خشوع ہے۔ اسی طرح اس صاحب عظمت و جلال کے قہر و غضب سے بچنے، اس کے مقرر کردہ حدود کی مخالفت سے احتراز اور اس کے احکام و آیات کی خلاف ورزی سے اجتناب و احتیاط کی جو بے چینی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے اور جو خلوت و جلوت ہر جگہ آدمی کو بیدار اور چوکنا رکھتی ہے وہ تقویٰ ہے۔

"مجھ ہی سے بچو" کا ٹکڑا بیک وقت دو حقیقتوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو یہ کہ مجھے کوئی بہت نرم چیز سمجھ کر

میری گرفت اور میرے غضب سے بے پروا نہ ہو جاؤ۔ جو میری نعمت کی ناقدری کرتے ہیں میرے عہد کو پامال کرتے ہیں، میری آیات کو مالِ بیع و شرا سمجھتے ہیں۔ جب میرا غضب ان پر نازل ہوتا ہے تو وہ ان کی کمر توڑ کے رکھ دیتا ہے اور اس وقت کوئی نہیں ہوتا ہے جو ان کو میرے غضب سے چھڑانے کے لیے کھڑا ہو سکے۔

دوسری حقیقت جو مفعول کی تقدیم سے یہاں پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم ڈرتے ہو کہ اگر تم نے اصل حقیقت ظاہر کر دی تو تمہارے عوام بگڑ کھڑے ہوں گے، تمہاری سرداری و پیشوائی خطرے میں پڑ جائے گی، تمہارے مقابل میں بنی اسمٰعیل کا سر اونچا ہو جائے گا اور تمہارے دوسرے دنیوی مفادات کو نقصان پہنچ جائے گا حالانکہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ڈرنے اور بچنے کی نہیں ہے، اصل ڈرنے کی چیز اگر کوئی ہے تو صرف میرا غضب ہے کیونکہ اس سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ البتہ میں اگر چاہوں تو اپنے غضب سے ڈرنے والوں کو ہر خطرہ سے بچا سکتا ہوں۔

ولا تلبسوا الحق بالباطل | لبس الثوب کے معنی ہیں اس نے کپڑا پہن لیا۔ لبس الامر علیہ کے معنی ہیں اس نے معاملہ کو گڈمڈ کر دیا۔ تلبیھم کے معنی ہوں گے، ان کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیا یا باہمدگر ٹکرا دیا۔ قرآن مجید میں ہے او یلبسکم شیعاً (یا تمہیں گروہ در گروہ کر کے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا دے)

لبس الشئی بالشئی کے معنی ہوتے ہیں ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ خلط ملط اور گڈمڈ کر دیا۔ آیت زیر بحث میں حق پر باطل کو ڈھانک دینے کا مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے۔ لبس کے اصل معنی میں یہ دونوں مفہوم مضمر ہیں اور یہاں یہ دونوں ہی بنتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ اسلوب دوسری جگہ بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے :-

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۸۲ - انعام)

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا ان کے لیے امن ہے اور وہ راہ یاب ہونے والے ہیں۔

آیت زیر بحث میں اشارہ ہے یہود کی اس بات کی طرف کہ انھوں نے تورات میں اپنی رائیں اور بدعتیں

داخل کر کے اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے حق اور اپنے داخل کیے ہوئے باطل کو ایک ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ قرآن مجید نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (۷۹ - بقرہ)

پس ہلاکی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب تصنیف کرتے ہیں، پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آئی ہے تاکہ اس کے ذریعے سے حاصل کریں حقیر قیمت، پس ان کی تباہی ہے اس چیز کے سبب جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے باعث جو وہ کما رہے ہیں۔

☆

یہود نے حق پر پردہ ڈالنے کے لیے تورات میں ہر قسم کے تصرفات کر ڈالے تھے، بعض چیزیں انھوں نے اس میں اپنی طرف سے داخل کر دی تھیں، بعض چیزیں اس میں سے نکال دی تھیں اور بعض چیزوں میں انھوں نے تبدیلیاں کر دی تھیں اور ان تمام تصرفات سے مقصود ان کا ان حقائق پر پردہ ڈالنا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی، ان کی قربان گاہ اور ان کے قبلہ وغیرہ سے متعلق تورات میں بیان ہوئے تھے اور جو آخری نبی کی بعثت کی نشان دہی کرنے والے تھے۔ یہود کو چونکہ یہ بات دل سے ناپسند تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نشانی تورات سے ظاہر ہو اس وجہ سے انھوں نے ان تمام باتوں کو چھپانے کی کوشش کی[1]۔

وتکتموا الحق وانتم تعلمون | اس ٹکڑے میں کوئی خاص لغوی اشکال نہیں ہے البتہ وتکتموا کے اعراب کے بارے میں اہل تاویل نے اختلاف کیا ہے۔ بعض لوگ یہاں اَن کو پوشیدہ مانتے ہیں اس وجہ سے تکتموا کو نصب کی حالت میں قرار دیتے ہیں، بعض اس کو سابق پر عطف قرار دے کر اس کو جزم کی حالت میں مانتے ہیں استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ عطف کی صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہاں حرف "لا" کا اعادہ نہ کرنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کو ظاہر کر رہی ہیں بلکہ

[1] اس قسم کی بعض باتوں کی طرف اشارہ آگے اسی سورہ میں آئے گا۔ جو لوگ زیادہ تفصیل کے طالب ہوں، استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے رسالہ ذبیح کا مطالعہ کریں۔

بات کے بعد یہ دوسری بات صرف ایک وضاحت اور ایک بیان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہود نے حق اور باطل کو گڈمڈ کرنے کی جو کوشش کی اس سے اصل مقصود ان کا حق کو چھپانا ہی تھا۔ تورات میں ان کو جس چیز سے روکا گیا تھا وہ تو یہی حق کو چھپانا تھا لیکن اس حق کو چھپانے کی جو شکل ظاہر میں انھوں نے اختیار کی تھی وہ حق اور باطل دونوں کو گڈمڈ کرنے کی تھی اس وجہ سے قرآن نے ان کو پہلے حق و باطل کو گڈمڈ کرنے سے روکا، پھر اس کتمان حق سے روکا جو درحقیقت حق و باطل کے التباس کی اس تمام کوشش کا اصل مقصود و مدعا تھا۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ اسی اصول پر وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ۔ اور لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ والی آیات کی بھی تاویل کرتے ہیں تفصیل اس کی اپنے مقام پر آئے گی۔

لفظ حق کی پوری تحقیق اسی سورہ میں آگے آرہی ہے۔ یہاں موقع کلام سے واضح ہے کہ حق سے مراد وہ حقائق ہیں جو تورات میں واضح کر دیے گئے تھے اور جواب قرآن نے اپنی تائید و تصدیق سے واضح سے واضح تر کر دیئے ہیں۔ ان حقائق کا زیادہ تر تعلق نبی آخر الزماں کی نشانیوں سے تھا، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ یہود ان نشانیوں پر پردہ ڈالنے سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ، وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ | اقامت صلوٰۃ کی پوری تحقیق شروع میں بیان ہوچکی ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

زکوٰۃ۔ زکوٰۃ کا لفظ زکا یزکو سے ہے جس کے معنی پاک ہونے کے ہیں۔ عربی میں نفس زکیہ اس نفس کو کہتے ہیں جو گناہوں سے پاک صاف ہو۔ دوسرا مفہوم اس مادے کے اندر بڑھنے اور نشوونما پانے کا ہے۔ زکا الزرع کے معنی ہوں گے کھیتی بڑھی اور اپجی۔ زکوٰۃ کے اندر پاکیزگی اور نشوونما دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے کہ زکوٰۃ نفس اور مال دونوں کو پاکیزگی بھی بخشتی ہے اور اس سے مال میں برکت اور بڑھوتری بھی ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی بعض آیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

مثلاً فرمایا ہے:-

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ۱۰۳ - توبہ

ان کے مالوں کا صدقہ قبول کرو، ان کو اس کے ذریعہ سے تم پاک کروگے اور ان کا تزکیہ کروگے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:-

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ

۳۹ - روم

اور جو تم دیتے ہو سود تاکہ لوگوں کے مالوں میں بڑھوتری ہو تو یہ چیز اللہ کے ہاں نہیں بڑھتی اور جو تم دیتے ہو زکوٰۃ، اللہ کی رضا جوئی کے لیے، تو یہی لوگ اپنے مال کو اللہ کے ہاں بڑھانے والے ہیں۔

زکوٰۃ کا لفظ ابتدا میں تو انفاق فی سبیل اللہ کی تمام قسموں کے لیے استعمال ہوتا رہا اور اس کا مفہوم وہی تھا جو لفظ صدقہ کا ہے لیکن بعد میں قرآن و حدیث کے استعمالات نے اس کو انفاق کی ان متعین مقداروں کے لیے خاص کر دیا جو اللہ اور رسول نے ہر مال میں غربا و فقراء کے لیے واجب کر دی ہیں۔ (باقی)

اطلاع

۱- میثاق عموماً ہر ماہ کی پانچ تک شائع ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس میں دو چار روز کی تاخیر بھی ہوجاتی ہے اس وجہ سے جن خریداروں کو پرچہ مہینہ کے پہلے عشرہ میں نہ ملے وہ فوراً تقاضے کے خطوط نہ لکھنے شروع کردیں بلکہ چند روز انتظار کرلیا کریں۔ پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت مہینے کے آخری عشرہ میں کرنی چاہیے۔

۲- جن خریداروں کو چندہ ختم ہونے کی پیشگی اطلاع بھیجی جاتی ہے، ان سے درخواست ہے کہ اگلے سال کا چندہ اطلاع ملتے ہی منی آرڈر کے ذریعہ سے بھیج دیں۔ اگر وہ اپنا چندہ بعد میں ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں یا کسی وجہ سے خریداری جاری رکھنا نہ چاہتے ہوں تو انہیں چاہیے کہ دفتر کو اپنے ارادہ سے مطلع کردیں تاکہ پرچہ وی۔ پی کرنے کی نوبت نہ آئے۔

منیجر ماہنامہ میثاق لاہور

مطالعۂ حدیث

مولانا عبدالغفار حسن صاحب

معازف و مزامیر کا شرعی حکم

(۳)

گذشتہ اشاعتوں میں صحیح بخاری کی روایت (جس میں گانے بجانے کے آلات کی مذمت ہے) کی تشریح کرتے ہوئے اُن احادیث کا مفہوم متعین کیا گیا تھا جن سے گانے بجانے کو "سنت نبوی" ثابت کیا جاتا ہے۔ آج کی اشاعت میں اس شبہ کا ازالہ مقصود ہے کہ اس قسم کے مسائل میں قرآن خاموش ہے، محض حدیث کی بنا پر کسی شے کی حرمت و حلت کا فتویٰ کیسے دیا جا سکتا ہے؟ اولاً تو یہ موقف ہی غلط ہے کہ جس چیز کے بارے میں قرآن بظاہر خاموش ہو اس کی حلت و حرمت کا فتویٰ سنت کی بنا پر نہیں دیا جا سکتا۔ یہ الگ مستقل موضوع ہے اس پر تفصیلی گفتگو کسی دوسرے موقع پر ہو سکتی ہے۔ یہاں موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے صرف اتنا بتلانا مقصود ہے کہ قرآن مجید نے حلت و حرمت کے ایسے واضح اصول اور ضابطے مقرر کر دیئے ہیں کہ ان کی روشنی میں معازف و مزامیر کی حلت و حرمت کا فیصلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ (ع-ح)

سورہ لقمان کے شروع میں پہلے ان لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں جو قرآن مجید سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنے غلط قسم کے مشاغل کی بنا پر قرآنی ہدایت سے محروم رہتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو "لہو الحدیث" خریدتے ہیں

تاکہ بغیر کسی دلیل کے خدا کی راہ سے بھٹکائیں اور اُسے مذاق بنائیں۔ یہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

(سورہ لقمان پ ۲۱)

"لھو" کے معنی امام راغب اصفہانی کی تحقیق کے مطابق یہ ہیں:-

اَللَّهْوُ ما يشغل الانسان عما يعنيه ويُهِمُّه مفردات راغب ص ۴۷۱

لہو ہر اس شے کو کہتے ہیں جو انسان کو اس کے مقصد سے ہٹا دے۔

امام شوکانی لکھتے ہیں:-

لهو الحديث كل ما يلهي عن الخير من الغناء والملاهي، والاحاديث المكذوبة وكل ما هو منكر۔ (تفسیر فتح القدیر ج ۴ ص ۲۳۶)

"لہو الحدیث سے مراد ہر وہ شے ہے جو نیک کاموں سے غافل کرے۔ گانا بجانا، بے سرو پا داستانیں اور ہر قسم کا منکر اس کے تحت آسکتا ہے۔

عام تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے کہ جس قوم میں "معازف و مزامیر" (گانے بجانے کے آلات) نے مقبولیت حاصل کی وہ صراطِ مستقیم سے ہٹ کر فواحش و منکرات کے سیلاب سے نہ بچ سکی۔ اسی بنا پر اکثر صحابہ کرام نے لہو الحدیث کی تفسیر میں غناء کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ سنت نبوی سے بھی اسی تفسیر کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

مشہور مفسر امام قرطبی لکھتے ہیں:-

ان اولى ما قيل في هذا الباب هو تفسير لهو الحديث بالغناء قال وهو قول الصحابة والتابعين

لہو الحدیث کی تفسیر میں جتنے بھی اقوال پائے جاتے ہیں ان میں سے راجح قول اس کا ہے جس نے لہو الحدیث سے غناء مراد لیا ہے، یہ صحابہ اور تابعین کا قول ہے۔

تفسیر فتح القدیر ج ۴ ص ۲۳۶

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ ان تمام تفسیری اقوال میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں پایا جاتا کیونکہ ان سب کا اصل مرکزی معنیٰ وہی ہے جس کی وضاحت امام راغب اور امام شوکانی کی زبانی مذکور ہوا

سطور میں کی جا چکی ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ "لہو الحدیث" کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ھُوَ الغناءُ واللّٰہِ الذی لا الٰہ	لہو الحدیث سے مراد غناء ہے، قسم ہے اس ذات کی
اِلّا ھُو یُردّدُھا ثلاثا	جس کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں ہے۔ یہ کلمہ حضرت
(ابن کثیر ج ۳ صـ۴۴۲)	عبداللہ نے تین بار فرمایا۔

اس تفسیر و تشریح میں حضرت ابن مسعود تنہا نہیں ہیں بلکہ مفسرِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت جابر اور اکابرِ تابعین، عکرمہ، سعید بن جبیر، مجاہد، مکحول، عمرو بن شعیب، حسن بصری بھی ان کے ہم نوا ہیں۔

قرآن فہمی میں تفسیرِ صحابہ کو جو اہمیت حاصل ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ امام حاکم لکھتے ہیں:۔

ان تفسیر الصحابی الذی شھد الوحی	ایسے صحابی کی تفسیر جس نے وحی اور نزول قرآن کا زمانہ
والتنزیل عند الشیخین حدیث مسند	پایا ہو امام بخاری اور امام مسلم کے نزدیک مسند حدیث
اغاثۃ اللہفان صـ۱۲۹	کے حکم میں ہے۔

امام ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ بعد والوں کی بہ نسبت صحابہ کرام کی تفسیر کو قبول کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔ قرآن ان کے سامنے نازل ہوا۔ وہ قرآن کے پہلے مخاطب تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن کی قولی اور عملی تفسیر کا ان کی نگاہوں نے خود مشاہدہ کیا تھا، زبان کے لحاظ سے فصاحت و بلاغت میں جو ان کا نمایاں مقام تھا اس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے بغیر کسی قوی دلیل کے ان کی تفسیر سے انحراف کیسے کیا جا سکتا ہے؟" اغاثۃ اللہفان صـ۱۲۹

اس آیت کی وضاحت میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "لہو الحدیث" کی حرمت اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ اضلال (گمراہ کرنا) مقصود ہو۔ کیونکہ قرآن میں لِیُضِلَّ عن سبیل اللہ فرمایا گیا ہے۔ اب اگر محض تفریحِ نفس مقصود ہو تو اس صورت میں گانے بجانے کو حرام کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے؟"

واضح رہے کہ لِیُضِلَّ میں "لام علت" بھی مانا جا سکتا ہے۔ یعنی لہو الحدیث اختیار کرنے کا اصل مقصد

لوگوں کو گمراہ کرنا ہو۔ نیز اس لام کو "لام عاقبت" قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی آخرکار نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معازف و مزامیر کے شیدائی راہِ حق سے ہٹ کر ضلالت کی وادیوں میں خود بھی گم ہو جاتے ہیں اور دوسروں کی گمراہی اور بے راہ روی کا بھی باعث بنتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو جو لطف و سرور رقص و سرود کی محفلوں میں حاصل ہوتا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی وہ قرآن اور ذکرِ الٰہی میں محسوس نہیں کرتے بلکہ قرآن کی تلاوت ایسے لوگوں کے لیے انتہائی انقباض اور وحشت کا موجب بنتی ہے۔ حقیقت میں ان کا وہی حال ہوتا ہے جس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا وَلّٰی مُسْتَکْبِرًا	جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ
کَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْھَا کَاَنَّ فِیْٓ اُذُنَیْہِ وَقْرًا	غرور و تکبر کرتا ہوا پلٹ جاتا ہے، گویا اس نے سنا ہی
سورہ لقمان پارہ ۲۱	نہیں جیسے اس کے دو کانوں میں بہرہ پن ہے۔

سورہ مدثر میں قرآن سے وحشت کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے:۔

فَمَا لَھُمْ عَنِ التَّذْکِرَۃِ مُعْرِضِیْنَ کَاَنَّھُمْ	یعنی ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ نصیحت سے اس طرح
حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَۃٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَۃٍ پ ۲۹	روگردانی کرتے ہیں کہ گویا وہ جنگلی گدھے ہیں جو کسی شیر
	کی صورت دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں۔

•

قرآن سے اعراض امام ابن تیمیہؒ غناء اور سماع کے نقصان اور نفع کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لیکن ان کی مضرت، نفع سے زیادہ ہی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح شراب اور قمار میں لوگوں کے لیے بعض فائدے ہیں، مگر ان کا نقصان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لیے شریعت نے ان کی اجازت نہیں دی اور یہ اس لیے کہ شریعت راجح مصلحت ہی کا لحاظ کرتی ہے جس چیز میں مصلحت کا امکان قوی ہوتا ہے۔ شریعت اُسے مستحسن رکھتی ہے لیکن جس میں نقصان کا احتمال زیادہ ہوتا ہے تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔"

اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی شخص پانچ درہم چوری کرے اور پھر دو درہم خیرات کر ڈالے تو خیرات کرنا اگرچہ نیک کام ہے مگر اس کی وجہ سے چوری مباح نہ ہوگی۔ یہی حال سماع اور غناء کا ہے، اس میں بھی

کوئی نفع بھی ہو سکتا ہے، مگر اس کی مضرت بہرحال نفع سے زیادہ ہی ہے۔ یہ نفس میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے، جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں جب اس کی چاٹ پڑ جاتی ہے تو آدمی کو قرآن کی تلاوت و سماع میں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی، بلکہ کبھی قرآن سے بیزاری ہو جاتی ہے۔ اس کا سماع نفس کے لیے بار گراں بن جاتا ہے۔ نفرت اور وحشت بڑھ جاتی ہے۔ جس طرح صادق مسلمانوں کی طبیعت پر تورات، انجیل اور اہل کتاب و صابئین کے علوم کی تحصیل گراں ہوتی ہے اسی طرح گانے بجانے کے دلدادہ کے لیے قرآن کی تلاوت و سماع میں گرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس چیز کی یہی مضرت کیا کم ہے کہ آدمی کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے شغف باقی نہیں رہتا۔

کراہت و نفرت | چونکہ سماع سے وہ بات حاصل نہیں ہوتی جسے اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں بلکہ اکثر اوقات اس سے وہ بات حاصل ہوتی ہے جسے اللہ اور اس کا رسول ناپسند کرتے ہیں بلکہ اس سے نفرت رکھتے ہیں، اسی لیے سماع کا حکم نہ اللہ نے دیا نہ اس کے رسول نے نہ سلف صالحین نے اور نہ مشائخ کرام نے۔

ممانعت کی وجہ | نفس پر آواز کا اثر اوقات و حالات کے اختلاف سے ہوا کرتا ہے، کبھی مسرت پیدا ہوتی ہے، کبھی غم کی کیفیت طاری ہوتی ہے، کبھی غصہ آ جاتا ہے، کبھی کوئی اور جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ سریلی اور رسیلی آواز بھی انسان کو اس طرح مست کر دیتی ہے جس طرح شراب سے مستی پیدا ہو جاتی ہے۔ مستی کے معنی یہ ہیں کہ نفس پر لذت اس درجہ حاوی ہو جائے کہ عقل و فہم باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی لذت حسی کی موجودگی میں عقل و فہم غائب ہو جائے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی، بلکہ مضر ہوتی ہے۔ ذکر الٰہی اور نماز سے غافل کر دیتی ہے، عداوت اور پھوٹ پیدا کر دیا کرتی ہے۔" رسالہ الرقص والسماع صفحہ ۵

اس موقع پر یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہنی چاہیے کہ قرآن مجید میں شراب اور جوئے کی حرمت بیان کرتے ہوئے اس کی علت اور وجہ یہ بتلائی ہے کہ ان دونوں کے ذریعہ شیطان انسانوں کے درمیان پھوٹ ڈالتا ہے۔ اللہ کی یاد اور نماز سے روکتا ہے۔ فرمایا:۔

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ سورہ مائدہ پ۷

شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈلوا دے۔ اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے روک دے۔ پس کیا تم ان کاموں سے باز رہو گے۔

کیا غناء اور سماع کے جواز کے لیے جو استدلال پیش کیا گیا ہے کیا بعینہ وہ شراب اور جوئے کی حلت پر چسپاں نہیں ہو سکتا۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ شراب اور جوئے سے ہماری دلچسپی محض تفریح نفس کے لیے ہے، نہ کہ لوگوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور اللہ کی یاد سے روکنے کے لیے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ لہو الحدیث غناء اور گانے بجانے کے آلات سے دلچسپی رفتہ رفتہ انسان کو راہ حق سے ہٹا دیتی ہے اور آخر کار نتیجہ ضلال (گمراہ ہونے) اور اضلال الناس (لوگوں کو گمراہ کرنے کی شکل ہی میں نمودار ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ زیر بحث آیت میں لیضل عن سبیل اللہ میں لام عاقبت" ماننا بے بنیاد نہیں ہے قرآن مجید سے اس کی مثال ملتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد ان کی والدہ نے ان کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا تھا۔ بعد میں فرعونیوں نے ان کو اٹھا لیا، قرآن مجید نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا (سورہ قصص پ۲۰)

حضرت موسیٰ کو فرعونیوں نے اٹھا لیا تاکہ وہ ان کے لیے دشمن اور غم کا باعث بنیں۔

اس آیت میں لام علت" کسی صورت میں مراد نہیں ہو سکتا، یہاں لام عاقبت ہی مراد ہے، یعنی موسیٰ علیہ السلام کو اٹھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فرعونیوں کے لیے عداوت اور مصیبت کا موجب بن گئے۔

غناء اور معازف و مزامیر کی حرمت پر قرآن مجید کی دوسری آیات سے بھی اہل علم نے استدلال کیا ہے، لیکن اس موقع پر صرف اسی ایک آیت کی تشریح پر اکتفا کی جاتی ہے۔

دوسرا شبہ | بعض حامیان موسیقی صحابہ کرام، تابعین اور سلف صالحین کے ناموں کی ایک طویل فہرست

پیش کرتے ہیں کہ یہ سب حضرات نہ صرف یہ کہ گانے بجانے کے حامی تھے بلکہ عملاً اس میں دلچسپی بھی لیا کرتے تھے، پھر دلچسپی بھی ایسی کہ بعض اوقات پوری رات اسی شغل میں گذار دیا کرتے تھے۔"

خیر القرون کا مسلک لیکن اصل حقیقت وہی ہے جسے امام ابن تیمیہؒ نے پیش کیا ہے۔" تالیاں بجانا گانا، ڈھول بجانا، بانسریاں بجانا، ایسی مجلسوں میں شریک ہونا اور اُسے عبادت و دین سمجھنا اسلام سے نہیں ہے۔ نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے، نہ آپ کے خلفاء نے روا رکھا ہے، نہ مسلمانوں کے کسی امام نے اُسے مستحسن قرار دیا ہے، دین داروں میں سے کسی نے بھی کبھی یہ فعل نہیں کیا، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں، نہ صحابہؓ کے زمانہ میں، نہ تابعین کے زمانہ میں، نہ تبع تابعین کے زمانہ میں بلکہ خیر القرون میں کوئی مسلمان بھی اس قسم کے سماع میں کبھی شریک نہیں ہوا، نہ حجاز میں، نہ شام میں نہ یمن میں نہ عراق میں نہ خراسان میں، نہ مغرب میں نہ مصر میں، بلکہ یہ چیز سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ تیسرے قرن میں یہ ایجاد کی گئی، اسی لیے امام شافعی نے اس کی نسبت فرمایا،

"بغداد میں میں ایسی چیز چھوڑ آیا ہوں جسے زندیقوں نے ایجاد کیا ہے" رسالہ وجد و سماع ص

امام مالک و اہل مدینہ کا طرز عمل دوسری جگہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ "اسحاق بن موسیٰ نے امام مالک سے سوال کیا کہ اہل مدینہ کس قسم کے گانے کو مباح سمجھتے تھے"، امام مالکؒ نے جواب دیا:—

— "یہ فعل ہمارے ہاں صرف فاسق ہی کرتے رہیں" یہ تصریح ان کے مذہب کی کتابوں میں مشہور و معروف ہے، اس کے بعد شیخ الاسلام لکھتے ہیں، کہ بعض لوگوں نے امام مالک کی نسبت کہا ہے کہ انھوں نے ستار اور سارنگی سے شغل کیا ہے۔ یہ ایک سخت تہمت ہے جو جاہلوں نے ایجاد کی ہے، یہ میں نے اس لیے بیان کر دیا کہ ابو عبدالرحمٰن سلمی اور محمد بن طاہر مقدسی نے اس باب میں بکثرت حکایات و آثار نقل کیے ہیں، جو لوگ علم صحیح اور احوال سلف سے واقف نہیں ہیں وہ ان کی تحریروں سے دھوکے میں پڑ سکتے ہیں۔

کچی جھوٹی روایات شیخ الاسلام امام تیمیہؒ نے واضح طور پر لکھا ہے کہ:-

"شیخ ابو عبدالرحمٰن سلمی میں نیکی، زہد، دین اور تصوف تھا مگر وہ اپنی کتابوں میں اپنے مقصود

کے مطابق تمام غث وسمین اور رطب و یابس روایات جمع کر گئے ہیں، چنانچہ ان کی کتابوں میں ایسی باتیں بھی موجود ہیں جو دین میں نفع پہنچا سکتی ہیں اور ایسی باتیں بھی ہیں، جو ناواقفوں کے لیے نقصان رساں بھی ہیں، بعض اہل علم نے ان کی روایت قبول کرنے میں تامل کیا ہے۔ حتیٰ کہ امام بیہقیؒ جب ان سے روایت کرتے تھے تو تصریح کر دیا کرتے تھے کہ یہ ابو عبدالرحمٰن نے ہمیں اپنی اصل کتاب سے سنایا ہے۔

محمد بن طاہر مقدسی اچھے محدث تھے، حدیث اور رجال حدیث سے پوری واقفیت رکھتے تھے مگر اکثر متاخر محدثین اور اہل زہد کی طرح وہ بھی ہر غث وسمین کو جمع کر دیا کرتے تھے" رسالہ وجد و سماع ص۶۱

واضح رہے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بعض شائع کردہ رسائل میں زیادہ تر انہی دونوں حضرات کی روایات پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اتحاف السادة المتقین شرح احیاء علوم الدین کے مصنف مرتضیٰ زبیدی کا سہارا بھی یہی روایات و آثار ہیں۔

عبداللہ بن جعفرؓ کی طرف بھی یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ گانے بجانے سے دلچسپی لیا کرتے تھے، اگر اس روایت کو کسی درجے میں درست مان لیا جائے تو اس کا جواب وہی ہے جو امام ابن تیمیہؒ نے دیا ہے:-

"یہ کہنا اور بھی مضحکہ انگیز ہے کہ فلاں فلاں ولی اللہ نے ایسا کیا ہے اور اگر یہ صحیح ہو تو دوسرے بکثرت اولیاء نے اس کی مذمت کی ہے۔ ایک ولی اللہ، دوسرے ولی اللہ پر اعتراض کر سکتا ہے۔ اولیاء اللہ میں باہم جنگ بھی ہو چکی ہے۔ جنگ صفین میں جب طرفین کی فوجیں بڑھیں تو لوگوں نے کہا کہ جنتی جنتیوں سے لڑنے چلے ہیں۔

اگر ولی اللہ کسی مکروہ یا ممنوع فعل کا مرتکب ہو تو اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہفوات اور لغزشوں سے ولی اللہ اپنی ولایت سے محروم نہیں ہو جاتا۔ پھر یہ بھی ہرگز ثابت نہیں کہ اولیاء سلف میں سے کسی نے بھی ایسے بدعتی سماع میں شرکت کی ہو جو لوگ

شدید ترین فتنوں میں مبتلا کر دے" رسالہ وحید و سماع صفہ ۶

امام ابن تیمیہؒ کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ جمل اور صفین میں صحابہ کی شرکت... یہ معنی نہیں رکھتی کہ قتال بین المسلمین جائز ہے۔

اسی طرح صحابہ میں سے اگر کسی صاحب نے غناء سے دلچسپی لی بھی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قرآنی اصول، قابل اعتماد احادیث اور جمہور صحابہ اور سلف صالحین کے مسلک کو نظر انداز کر کے عبداللہ بن جعفر کے مسلک کو "اسوہ حسنہ" قرار دے دیا جائے۔ بشرطیکہ ان کی طرف غناء کی نسبت صحیح طور پر ثابت بھی ہو۔

سلف صالحین کا مسلک ابوبکر طرطوشی لکھتے ہیں کہ ابراہیم بن سعد اور عبید بن حسن العنبری قاضی بصرہ یہ دونوں غناء کے قائل تھے، لیکن ان کا یہ مسلک جماعت مسلمین کے یکسر خلاف تھا، امت میں کوئی بھی اس بارے میں ان کا ہم نوا نہیں ملتا۔ اغاثۃ اللہفان صفہ ۱۳۳

علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں کہ عز بن عبدالسلام اور ابن دقیق السعیدؒ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ سماع کے قائل تھے بے بنیاد اور سراسر جھوٹ ہے۔ تفسیر روح المعانی ج ۲۱ صفہ ۶۸

ائمہ اربعہ کا مسلک علامہ آلوسیؒ امام طرطوشی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ غناء کی حرمت کے قائل تھے، اہل کوفہ اور اہل بصرہ کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، سفیان حماد، شعبی، ابراہیم نخعی سب کا یہی مسلک تھا۔

امام مالک بھی اس کی حرمت کے قائل تھے۔ ان کا ایک فتویٰ ہے کہ اگر لونڈی خریدے اور بعد میں وہ مغنیہ ظاہر ہو تو مشتری اُسے عیب دار قرار دے کر واپس کر سکتا ہے۔

امام مالک سے اہل مدینہ کے طرز عمل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا:—

اِنّما یفعلہ عندنا الفُسّاق یعنی ہمارے ہاں یہ کام فاسق فاجر لوگ کرتے ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ بھی اس کی حرمت کے قائل تھے۔

امام محترم کے صاحبزادے عبداللہ نے غناء کے بارے میں اپنے والد سے پوچھا، تو انھوں نے

جواب دیا کہ غناء دل میں نفاق کا بیج بوتا ہے۔

امام شافعی اُسے مکروہ مشابہ باطل قرار دیتے ہیں۔ ان کا فتویٰ ہے کہ جو اس مشغلے میں زیادہ دلچسپی لے وہ احمق ہے اس کی شہادت رد کر دی جائے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔

تفسیر روح المعانی ج ۲۱ صفہ ۶۱

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی اشارات، سنت کی تصریحات، آثار صحابہ، اقوال تابعین اور سلف صالحین کا تعامل اس بات پر گواہ ہے کہ غنا اور اس کے آلات سے وابستگی اسلامی مزاج کے یکسر خلاف ہے۔ سوائے دو چار افراد کے ملت کا فیصلہ یہی ہے:—

فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ ۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مکتبہ میثاق نے

ہر قسم کی دینی اور علمی کتابیں مہیا کرنے کا انتظام کیا ہے۔ کتابیں منگانے کے لیے رقوم پیشگی بھیجی جائیں، یا بذریعہ وی پی طلب کی جائیں۔

مینیجر مکتبہ میثاق لاہور

مقالات

مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب[1]

دنیا میں مختلف قومیں اور مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں، ان سب کے عبادت و قربانی اور نذر و نیاز کے جدا جدا طریقے اور مختلف مرکز ہیں، لیکن ان تمام مرکزوں میں اللہ تعالیٰ نے جو عزت و حرمت اور جو عظمت و فضیلت خانہ کعبہ کو عطا کی ہے وہ دنیا کے کسی اور گھر یا کسی اور عبادت گاہ کو حاصل نہیں۔ مسلمانوں کا تو وہ قبلہ ہی ہے، ان کے نزدیک تو اس کے برابر کسی اور گھر کی عزت و عظمت ہو سکتی ہی نہیں مگر دوسری قومیں اور ملتیں بھی خانہ کعبہ کے شرف و امتیاز کو تسلیم کرتی رہی ہیں۔ مشہور مورخ مسعودی نے اپنی تاریخ میں ہندوستانی حکماء اور فلاسفہ کے ایک گروہ کا یہ خیال نقل کیا ہے:۔

وقد ذھب قوم منھم الی ان بیت الحرام ھو بیت زحل وانما طال عندھم بقاء ھذا البیت علی مرور الدھور معظما فی سائر الاعصار لانہ بیت زحل وان زحل تولاہ لان زحل من شانہ البقاء والثبوت فما کان لہ تغیر زائل ولا داثر ولا عن التعظیم حائل۔

ایک جماعت کہتی ہے کہ خانہ کعبہ دراصل زحل کا گھر ہے اس کے نزدیک امتداد زمانہ کے باوجود اس گھر کے باقی رہنے اور ہر زمانہ میں اس کے متبرک و محترم مانے جانے کا یہی سبب ہے کہ وہ زحل کا گھر ہے اور وہی اس کا نگراں ہے کیونکہ زحل کی شان بقاء و دوام ہے اس لیے جو چیز اس سے متعلق ہوگی اس کو زوال و فنا نہیں واقع ہوگا اور اس کی تعظیم میں بھی فرق نہ آئے گا۔

اس جماعت کے احترام کعبہ کی مذکورہ بالا توجیہ اگرچہ محض مشرکانہ توہم پرستی پر مبنی ہے لیکن اس سے

اتنا ظاہر و ثابت ہے کہ یہ کعبہ کو محترم و مقدس مانتی تھی۔

اسی طرح دنیا کی دوسری قومیں بھی حتیٰ کہ یہود و نصاریٰ جو بنی اسرائیل کے مقابلہ میں بنی اسماعیل کے کسی عز و شرف کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور اپنی خاندانی اور نسلی برتری کے زعم میں بنی اسماعیل کے خلاف ہمیشہ بغض و کینہ اور رشک و حسد کے جذبات میں مبتلا رہے اور قرآن مجید نے ان کے رشک و حسد ہی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا (نساء ۵۴)

کیا وہ (اہل کتاب) اس لیے لوگوں سے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انھیں اپنا فضل عطا کیا تو ہم نے ابراہیم کی اولاد (بنی اسماعیل)[1] کو کتاب و حکمت اور زبردست اقتدار و سلطنت عطا کیا ہے۔

لیکن وہ بھی اپنی تمام ناروا جسارتوں، مذموم حرکتوں اور باطل تحریفات کے باوجود اس گھر کی عزت و حرمت کا انکار نہ کر سکے۔ ان کا سنجیدہ اور دیانت دار طبقہ ہمیشہ اس کی برتری اور فضیلت کا اعتراف کرتا رہا۔ یاقوت کا بیان ہے:

ولیست امۃ فی الارض الا وھم یعظمون ذالک البیت ویعترفون بقدمہ وفضلہ وانہ من بناء ابراھیم حتی الیھود والنصاریٰ والمجوس والصابئۃ[2]

دنیا کی ہر قوم خانہ کعبہ کی عظمت، فضیلت، قدامت اور اس کے بناء ابراہیمی ہونے کی قائل ہے یہاں تک کہ یہود و نصاریٰ، مجوس اور صابی مذہب والے بھی یہی سمجھتے ہیں۔

اہل عرب کفر و شرک کی تمام آلودگیوں میں مبتلا ہو گئے تھے، انھوں نے حج و قربانی کی رسمیں بھی بالکل بگاڑ لی تھیں اور ملت ابراہیمی سے بھی وہ منحرف ہو گئے تھے لیکن خانہ کعبہ پر وہ ہمیشہ اپنی جانیں چھڑکتے رہے۔ ان کے نزدیک

[1] اس آیت میں عموماً مفسرین نے آل ابراہیم سے بنی اسرائیل ہی کو مراد لیا ہے لیکن مختلف وجوہ سے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہمارے نزدیک اس سے بنی اسماعیل مراد ہیں۔ (ض)

[2] معجم البلدان ج ۷، صفحہ ۲۵۹

حج، قربانی اور دوسری تمام مذہبی رسموں کا مرکز یہی گھر تھا اگرچہ یہ رسمیں صورت و معنی دونوں ہی اعتبارات سے بالکل مسخ ہو کر رہ گئی تھیں۔ چنانچہ قرآن نے ان کی نماز کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً (انفال ۳۵)

ان کی نماز خانۂ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ ملّت ابراہیمیؑ پر ہونے کے مدعی تھے اور اسے اپنے لیے انتہائی فخر و ناز کی چیز سمجھتے تھے لیکن قرآن نے ان کے اس دعوے کی تردید کی کہ ان مشرکانہ رسوم کے ہوتے ہوئے تم کس منہ سے اپنے کو حضرت ابراہیمؑ کا متبع اور پیرو کہتے ہو، کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ابراہیمؑ کا شرک و بت پرستی سے کوئی تعلق نہ تھا وہ ایک مومن قانت اور ایک مسلم حنیف تھا۔

مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرَاهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (آل عمران ۶۷، ۶۸)

ابراہیم یہودی اور عیسائی نہ تھا بلکہ ہر طرف سے کٹ کر صرف خدا کا فرمانبردار بندہ تھا اور وہ مشرکین میں سے بھی نہیں تھا۔ ابراہیمؑ کے اصل حقدار اس کی حقیقی پیروی کرنے والے ہیں اور یہ نبی اور مسلمان بھی اس کے حقدار ہیں (اس لیے کہ انھوں نے اس کی اتباع کی ہے) اور اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا سرپرست اور دوست ہے۔

•

کعبہ کی عظمت و تقدیس ہی کی وجہ سے اہل عرب اس کی قسمیں کھاتے اور معاہدات وغیرہ کے موقع پر تو خاص طور پر اس گھر کے پاس آ کر قسمیں کھاتے تاکہ قول و قرار اور عہد و میثاق میں زیادہ سے زیادہ زور و قوت پیدا ہو چنانچہ ان کے اشعار میں اس طرح کی قسموں کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے امعان فی اقسام القرآن میں اس قسم کے اشعار نقل کیے ہیں ہم یہاں چند شعروں کے نقل پر اکتفار کرتے ہیں۔ سبعہ معلقہ میں زہیر کا مشہور شعر ہے:-

فاقسمت بالبیت الذی طاف حوله
رجال بنوه من قریش وجرهم

(اس گھر (کعبہ) کی قسم جس کا طواف قبیلہ قریش و جرہم کے وہ لوگ کرتے تھے جنھوں نے اسے بنایا تھا۔)

خانۂ کعبہ سے متعلق دوسری مقدس اور یادگار چیزوں کی بھی بطور شہادت قسمیں کھاتے، غنیمہ اعرابیہ اپنے بیٹے کی تعریف میں کہتی ہے:-

احلفت بالمروة یوما والصفا
انك خیر من تفاریق العصا

(میں کسی روز مروہ کی اور کبھی روز صفا کی قسم کھاتی ہوں کہ تو لٹھیا کے ٹکڑوں سے زیادہ بہتر ہے۔)

حارث بن عباد کا شعر ہے:-

کلا ورب الراقصات الی منی
کلا ورب الحل والاحرام

(ہرگز نہیں، قسم ہے ان اونٹنیوں کے رب کی جو رقص کرتی ہوئی منیٰ کی طرف جا رہی ہیں۔ ہرگز نہیں حِل و حرم کے رب کی قسم)

خانۂ کعبہ کا احترام دلوں پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ عیسائی بھی کعبہ کی قسمیں کھاتے تھے چنانچہ اخطل کا شعر ہے:-

حلفت بمن تساق له الهدایا
ومن حلت بکعبته النذور

(میں اس کی قسم کھاتا ہوں جس کے لیے قربانی کے جانور جاتے ہیں اور جس کے کعبہ میں نذریں حلال ہوتی ہیں۔)

عہد اسلامی میں بھی خانہ کعبہ سے متعلق چیزوں کی قسمیں کھانے کی روایت باقی رہی۔ فرزدق کہتا ہے:-

الم ترنی عاهدت ربی واننی
لبین رتاج قائما ومقام

علی حلفة لا اشتم الدهر مسلما
ولا خارجا من فی زور کلام

(کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میں نے باب کعبہ اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے رب سے عہد کیا ہے کہ کسی مسلمان کو گالی نہ دوں گا اور نہ اپنے منہ سے کوئی جھوٹی بات نکالوں گا)

حطیئہ کا شعر ہے:-

لعمر الراقصات بکل فج
من الرکبان موعدها مناها

(سواروں کو لے کر ہر راستہ سے اچھلا کر جانے والی اونٹنیوں کی قسم جن کی منزل منیٰ ہے)

خانۂ کعبہ کی حرمت و عزت ہی کی وجہ سے مشرکین عرب اس کی خدمت و حفاظت، تولیت و نگرانی

اور اس کے انتظام و انصرام میں پوری دلچسپی اور انہماک کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ اس گھر کی خدمت سے متعلق مختلف عہدے اور مناصب تھے جو مختلف گھرانوں میں بٹے ہوئے تھے اور یہ لوگ ہمیشہ ان بورہ قی عہدوں اور مہام کو فخر و مسرت کے ساتھ انجام دیتے تھے اور کسی حال میں بھی اپنے اس عزت و شرف سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ قرآن پاک کی ان آیتوں میں اسی چیز کی طرف اشارات ہیں

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۚ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ○ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ ۖ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ○ أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (توبہ ۱۷-۱۹)

مشرکین کے لیے زیبا نہیں کہ وہ اپنے اوپر کفر کی گواہی دینے کے باوجود اللہ کی مسجدیں آباد کریں ان کے کام اکارت ہوگئے اور وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنے کا حق اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے، نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور صرف اللہ سے ڈرنے والوں کو ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ کامیاب ہوں۔ کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی تولیت کو اللہ اور معاد پر ایمان اور راہ الٰہی میں جہاد کرنے والے لوگوں کے کام کے برابر کردیا ہے حالانکہ یہ لوگ برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ (انفال ۳۴)

اللہ کیوں انھیں عذاب نہ دے حالانکہ وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں اور مسجد حرام کے ذمہ دار اور سرپرست لوگ وہ نہیں بلکہ پرہیزگار لوگ ہیں۔

غرض وہ خانۂ کعبہ کو اپنی عبادت گاہ اور عظمت و سیادت کی بنیاد سمجھتے تھے اس لیے اس کی خدمت و حمایت کے لیے ہر وقت تیار رہتے اور یہ عظمت و محبت ان کے دل میں اس قدر پیوست ہوگئی تھی کہ اس کی ذرا بھی توہین انھیں گوارا نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ابرہہ اس گھر کو ڈھانے کے لیے اپنا لشکر جرار لے کر چڑھا

تو سب کے خون میں گرمی آگئی اور انھوں نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔ بعض قبائل نے اس اہم اور نازک موقع پر اس گھر کی حمایت و حفاظت میں بزدلی دکھائی تو عرب شاعروں نے اس کی مذمت کی، ضرار بن خطاب کا شعر ہے ؎

فرت ثقیف الی لاتها   بمنقلب الخائب الخاسر

(اور ثقیف نامراد اور ناکام آدمی کی طرح اپنے بت لات کی طرف بھاگ گئے۔)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس گھر کی قدر و منزلت اہل عرب کی نگاہ میں کتنی زیادہ تھی۔

قرآن مجید نے بھی کئی مقامات پر اس گھر کی عزت و فضیلت کا ذکر کیا ہے، یہ ساری چیزیں ہمیں دعوت دیتی ہیں کہ اس گھر کی اہمیت کے اسباب معلوم کریں اور غور کریں کہ دنیا کی بے شمار عبادت گاہوں کے مقابلہ میں ایک ویرانہ اور غیر آباد مقام میں اس واقع مرکز عبادت کی کیا خصوصیات ہیں اور اسلام نے اس کے امتیاز اور فضل کے کیا وجوہ بیان کیے ہیں تاکہ ہم اس کی حرمت و عزت کا پورا پورا حق ادا کرسکیں اور ہمارا حال ان قوموں جیسا نہ ہو جنھوں نے اپنے مرکز عبادت اور اپنے قبلہ کی توہین کی۔ کیونکہ یہود و نصاریٰ نے بیت المقدس کے ساتھ جو درد انگیز سلوک اور گستاخانہ برتاؤ کیا ہے وہ تاریخ کی ایک درد انگیز کہانی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح کے فتنوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔

خانۂ کعبہ کی فضیلت کے وجوہ خانۂ کعبہ کی اہمیت اور فضیلت کے متعدد اور گوناگوں اسباب ہیں۔ ان سب کا استقصار نہایت دشوار اور مشکل ہے۔ تاہم چند اہم خصوصیتوں اور خاص اسباب پر ہم روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۔ خانۂ کعبہ کی عظمت اور بلندی کی پہلی اور اہم وجہ یہ ہے کہ وہ دین الٰہی کی اصل و اساس اور توحید اور خدا پرستی کا اولین مرکز ہے۔ اس کی بنیاد ہی اس لیے رکھی گئی تھی کہ دنیا میں یہاں سے خدائے واحد کی پرستش اور عبادت کا اشتہار و اعلان اور شرک و بت پرستی کا استیصال ہو۔

یہ مسئلہ اگرچہ مورخین اور اصحاب تحقیق کے نزدیک مختلف فیہ ہے کہ خانۂ کعبہ کی تعمیر کب اور کس نے کی، اس کے اولین بانی حضرت آدمؑ ہیں یا حضرت ابراہیمؑ۔ بلکہ بعض تو یہ بھی کہتے ہیں کہ سب سے پہلے خدا کے

فرشتوں نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ میں ان اقوال کی تحقیق و تنقید و ترجیح کی بحث میں پڑے بغیر صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ خدا پرستی اور دینِ الٰہی کا سب سے پہلا اور قدیم مرکز ہے اور دنیا کی تمام عبادتگاہوں کے مقابلہ میں وہی سب سے اولین تعمیر اور عبادت گاہ ہے اور یہ امر اس قدر ثابت اور متحقق ہے کہ عام اقوام و ملل بھی اس کی قدامت اور اولیت کی قائل ہیں، یاقوت حموی کا بیان پہلے گذر چکا ہے۔ قرآن مجید سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے :-

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ (آل عمران ۹۶)

بیشک (عبادت الٰہی کا) پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے اور سراپا خیر و برکت اور دنیا والوں کے لیے موجب ہدایت ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ (حج ۲۹)

انھیں قدیم گھر کا طواف کرنا چاہیے۔

اسی سورہ میں ایک اور جگہ کہا گیا ہے :

ثُمَّ مَحِلُّھَآ اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ (حج ۳۳)

پھر انھیں (قربانی کے جانوروں کو) قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔

•

ان آیات میں خانۂ کعبہ کی قدامت و اولیت کا ثبوت بھی ملتا ہے اور پہلی آیت سے اس کے مقدس و متبرک ہونے کی دلیل بھی، بلاشبہ وہ توحید اور خدا پرستی کا سب سے پہلا گھر ہے۔ اس کی تعمیر کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کی پرستش اور عبادت کا اولین مرکز، شرک و بت پرستی کے سدباب کا ذریعہ اور دینِ الٰہی کی عظمت و سربلندی کے اظہار کا وسیلہ بنے، حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے دینِ الٰہی کی منادی اور حق پرستی کی اشاعت کے لیے ایک بیابان میں اس گھر کی تعمیر اس وقت شروع کی تھی جب ساری دنیا ظلم و جہالت، وحشت و بربریت اور کفر و شرک کی ہمہ گیر بیماریوں میں مبتلا تھی۔ علامہ شبلی مرحوم لکھتے ہیں :

"دنیا میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، ایران، ہند، مصر، یورپ میں عالمگیر اندھیرا تھا،

قبولِ حق ایک طرف، اس وسیع خطۂ خاک میں گز بھر زمین نہیں ملتی تھی جہاں کوئی شخص خالص خدائے واحد کا نام لے سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کلدان میں یہ صدا بلند کرنی چاہی تو آگ کے شعلوں سے کام پڑا۔ مصر آئے، ناموس کو خطرہ کا سامنا ہوا۔ فلسطین پہنچے کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ خدا کا جہاں نام لیتے تھے شرک و بت پرستی کے غلغلہ میں آواز دب کر رہ جاتی تھی۔ معمورۂ عالم کے صفحے نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے، اب ایک سادہ، بے رنگ، ہر قسم کے نقش و نگار سے معرا ورق درکار تھا جس پر طغرائے حق لکھا جائے۔ یہ صرف حجاز کا صحرائے ویران تھا جو تمدن اور عمران کے داغ سے کبھی داغدار نہیں ہوا تھا،

حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کو عرب میں لائے اور ان کو یہیں آباد کیا۔ حضرت سارہ نے (جیسا کہ توراۃ میں ہے) کچھ عرصہ کے بعد انتقال کیا، حضرت ابراہیمؑ مکہ میں چلے آئے حضرت اسماعیلؑ جوان ہو چکے تھے، اعلانِ حق میں ایک ہم آواز ہاتھ آیا دونوں نے مل کر ایک چھوٹے سے چوکھونٹے گھر کی بنیاد ڈالی وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ....."

گویا طغرائے حق لکھنے اور طغرائے باطل کو معدوم کرنے کے لیے اس گھر کی بنیاد پڑی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰھِیْمَ مَکَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِکْ بِیْ شَیْئًا وَّطَھِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ (حج ۲۶)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیمؑ کو بیت اللہ کے پاس آباد کیا اور اسے تاکید کی کہ میرا کسی کو شریک نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف کرنے اور میری عبادت میں کھڑے ہونے اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا

•

اس سے پہلے والی آیت میں مشرکین کو زجر و توبیخ کی گئی ہے کہ وہ اس مقدس اور پاکیزہ گھر کی زیارت سے لوگوں کو روکتے ہیں اور علی الاعلان یہاں شرک و بت پرستی کی اشاعت کرتے ہیں حالانکہ حضرت ابراہیمؑ

نے اس گھر کو اس لیے بنایا تھا کہ جب سارے لوگ اس گھر کی زیارت کریں گے تو تعلیم توحید اور دعوت ابراہیمی کی عام اشاعت ہوگی اور کفر و شرک کا بالکلیہ قلع قمع ہو جائے گا۔

دوسری جگہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا یوں نقل کی گئی ہے:-

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (ابراہیم ۳۵)	پروردگار اس شہر کو امن والا بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا۔

اب ایک نظر حضرت ابراہیمؑ کی مقدس اور پاکیزہ سیرت پر ڈال کر بھی دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی اس گھر کے توحید اور حق پرستی کا مرکز اور عدل و تقویٰ پر مبنی ہونے کا واضح ترین سبب ہے، کیونکہ ان کی تمام تر سیرت توحید اور خدا پرستی سے نورانی اور کفر و شرک کے ہر شائبہ سے بیزاری کا ایک اعلان ہے۔ قرآن مجید نے حضرت ابراہیمؑ کی سیرت کا جو سب سے تابناک اور درخشاں پہلو ہمارے سامنے بیان کیا ہے وہ ان کی حنیفیت (شرک بیزاری) اور اسلام و اطاعت ہے:-

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (البقرہ ۱۳۱)	جب ابراہیم سے اس کے رب نے کہا اسلام لا (اپنے کو بالکل خدا کے حوالہ کردے) تو اس نے کہا میں پروردگار عالم کا خالص فرمانبردار بن گیا۔

ملتِ ابراہیمی کی اصل حقیقت یہ ہے کہ تمام باطل عقائد و تصورات کو ترک کر کے پوری یکسوئی کے ساتھ صرف خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے۔ اسی لیے ہماری نمازوں کی ابتدا اس مبارک کلمہ سے ہوتی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کا مقولہ اور ان کے کمال اسلام اور کمال ایمان کی تصویر ہے:-

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام ۹)	میں ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کرتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور میں مشرک نہیں۔

قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بالکل خدا کے مطیع و منقاد بندے تھے اور ان کا کفر و شرک سے کوئی تعلق نہ تھا۔ (باقی)

اجتماعیات و سیاسیات

امین احسن اصلاحی

اسلامی قومیت کے عوامل

(۲)

وطنی قومیت کے مفاسد

وطنی قومیت کے اندر مذکورہ بالا مفاسد کے علاوہ کچھ مزید مفاسد بھی ہیں جن کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں لیکن اصل بحث سے پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ وطن کا ایک عامل وطنیت ہونا ایک علیحدہ چیز ہے اور وطن کو اساس بنا کر مختلف قومیتوں سے ایک متحدہ قومیت کا کنبہ جوڑنا ایک علیحدہ شے ہے۔ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے وہ مقتضائے فطرت ہے، جس طرح ہر شخص کو اس کا گھر عزیز ہوتا ہے، اس کے کونے کونے اور گوشے گوشے سے اس کی روایات وابستہ ہو جاتی ہیں، اس کی حفاظت اور اس کے اوپر اپنا حق قائم رکھنے کے لیے وہ بسا اوقات اپنا مال اور اپنی جان سب کچھ قربان کر دیتا ہے اور ایسا کر گزرنا ہر حق پسند کے نزدیک ایک مستحسن اور غیرت مندانہ کام سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر قومیت کو اس کا وطن عزیز و محبوب ہوتا ہے وہ اس کو اپنی جنم بھومی اور مادر وطن سمجھتی ہے، اس کو اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کا گہوارا خیال کرتی ہے، اس کے چپہ چپہ پر اس کے اسلاف کی عظمت اور اس کے آباء و اجداد کے کارناموں کی تاریخ ثبت ہوتی ہے، اس کے دریا اور پہاڑ اور اس کے نشیب و فراز سب کی زبانوں پر اس کی روایتیں اور حکایتیں ہوتی ہیں۔ اس کے پہاڑوں میں اس کی زندگی کے سرچشمے، اس کے کھیتوں اور باغوں میں اس کی معاش و معیشت کے ذخیرے اور اس کی وادیوں اور اس کے کہساروں میں اس کی خوشیاں اور اس کی بہاریں ہوتی ہیں اس وجہ سے ہر قوم اپنے وطن کو اپنی مشترک دولت سمجھتی ہے اور یہ اشتراک اس کے اندر ہم وطنی کا جذبہ پیدا کرتا ہے جو اس کو وطن سے مشترک استفادہ

اور اس کی مشترک حفاظت وصیانت کے لیے برابر جوڑے رکھتا ہے۔ یہ چیز عین تقاضائے فطرت ہے، نہ یہ عقل کے خلاف ہے اور نہ مذہب و اخلاق کے۔ لیکن دوسری چیز یعنی وطن کو اساس قرار دے کر مختلف قومیتوں کو ایک متحدہ قومیت میں جوڑ ڈالنا ایک بالکل مختلف چیز ہے جس کی خرابیاں بالکل واضح ہیں۔

وطن کی بنیاد پر مختلف قومیتوں سے ایک متحدہ قومیت جو بنتی ہے اس میں اصل مطمح نظر تو یہ ہوتا ہے کہ ایک وطن میں رہنے بسنے والی ایک سے زیادہ قومیتیں وطن کے سوا دوسرے عوامل قومیت ۔ نسل، زبان، کلچر، روایات اور مذہب ۔ کو جو ان کے اندر اپنے الگ الگ تشخص اور اپنی مخصوص انفرادیت کا احساس پیدا کرتے ہیں ختم کر دیں اور ان کی جگہ ایک مخلوط نسل، ایک مشترک زبان، ایک مشترک ثقافت اور ایک مشترک مذہب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ بات کہنے میں بھی بڑی بھونڈی معلوم ہوتی ہے اور عملاً بھی بہت بعید از قیاس نظر آتی ہے اس وجہ سے کبھی یوں چاہا ہے کہ مختلف قومیتیں الگ الگ تشخصات کو اگر محفوظ رکھنا چاہیں تو اپنے الگ دائروں کے اندر محفوظ رکھیں لیکن اجتماعی و سیاسی دائرے میں ایک ہی قوم کی حیثیت سے نمایاں ہوں اور اپنے انفرادیت پسندانہ رجحانات و عوامل کو اس میں مخل نہ ہونے دیں۔

اٹھارویں صدی سے پہلے تو عملاً یہی صورت تھی کہ غالب اور فتح مند قومیت مغلوب قومیت کے ان تمام تشخصات کو تقریباً ختم کر دیتی تھی جو اس کے انا کو زندہ رکھنے والے خیال کیے جاتے تھے لیکن اٹھارویں صدی میں نپولین کی فتوحات اور اس کے بعد پہلی جنگ عظیم نے مختلف اسباب سے جن کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی، قومیتوں کے اندر اپنے امتیازی تشخصات کو زندہ اور باقی رکھنے کا احساس اتنا قوی کر دیا کہ غالب قومیتوں کے لیے ان سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں رہا۔ اب اگرچہ ایک نظریہ کی حیثیت سے یہ مسلّم ہے کہ ہر قومیت کو اپنی ہستی، اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کو باقی رکھنے کا حق ہے اور یہ بات بظاہر نہایت اچھی بھی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا سارا حسن صرف کاغذ کے صفحات ہی پر ہے، عمل میں آکر اس کی یہ ظاہری چمک دمک بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے اور اس کی تمام اندرونی خرابیاں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ ہم یہاں اس کی بعض نمایاں خرابیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ یہ قومیت متضاد عناصر کا ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ بظاہر تو یہ عناصر ایک ہی

بندھن میں باندھ دیئے جاتے ہیں لیکن بباطن ان کی امنگیں اور ان کے حوصلے ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہتے ہیں۔ جہاں نسل، زبان، تہذیب، ادب اور مذہب کے اتنے اختلافات موجود ہوں وہاں صرف ہم وطنی کا رشتہ ان کو باہم جوڑے رکھنے میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتا۔ ان کے درمیان اختلاف اور نزاع کے جو محرکات موجود ہوتے ہیں وہ برابر اپنا عمل کرتے رہتے ہیں اور کبھی ان کو ایک قوم کی طرح پوری یک جہتی کے ساتھ کسی قومی نصب العین کے لیے کام نہیں کرنے دیتے۔ یہ قومیت کامیاب صرف اسی صورت میں ہوتی ہے جب تضاد کے یہ اسباب یا تو سطحی ہوں، یا پوری طرح دبا دیئے گئے ہوں، یا دوسرے عناصر کمیت و کیفیت کے اعتبار سے اتنے ناقابل لحاظ ہوں کہ غالب عصبیت کے مقابل میں وہ کان دبائے پڑے رہنے پر مجبور اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہنے ہی میں اپنی سلامتی سمجھتے ہوں۔

اس کی دوسری خرابی یہ ہے کہ اس قومیت کی تشکیل کرنے والے مختلف اجزاء مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے پاس جو قیمتی ورثہ خود ان کی قومی روایات، قومی ادب، اور اپنے آبائی دین کا ہے اس کو تو اجتماعی و سیاسی زندگی سے خارج کرکے سڑنے اور گلنے کے لیے چھوڑ دیں اور اسی کی جگہ پر ہر چیز ایک مصنوعی شکل میں قبول کرنے پر راضی ہوں۔ یہ قربانی صرف انہی عناصر کو نہیں کرنی پڑتی ہے جو عددی اعتبار سے اقلیت میں ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات اپنے دوسرے ساتھی یا ساتھیوں کو مطمئن کرنے کے لیے شریک غالب کو بھی یہ قربانی کرنی پڑتی ہے۔ ادب میں رجحانات بدلتے ہیں، زبان کا ڈھانچہ متغیر ہوتا ہے، روایات کا ایک نیا ملغوبہ تیار ہوتا ہے، رسوم میں بالکل بے گانہ آمیزشیں ہوتی ہیں، تاریخ ایک نیا قالب اختیار کرتی ہے، جو عدو سمجھے جاتے تھے وہ ہیرو بنتے ہیں، جو ہیرو خیال کیے جاتے تھے بسا اوقات ان کے نام کتابوں کے صفحات اور ذہنوں کی الواح سے کھرچ کھرچ کر نکالے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ مصیبت اس وطنی قومیت کے ہاتھوں مذہب پر آتی ہے۔ مذہب ایک قوی ترین عامل قومیت ہے اور سطحی مفادات کے آگے مشکل ہی سے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ اس وجہ سے قومیت کی تشکیل میں اس کو سب سے بڑا مانع قرار دے کر اس کا علاج یہ سوچا گیا ہے کہ اس کو اجتماعی و سیاسی زندگی سے بالکل ہی خارج کرکے مسجد، یا مندر، یا کلیسا کے

اندر بند کر دیا جائے۔ اس لادینیت کے بغیر وطنی قومیت کا ڈھانچہ کھڑا ہو ہی نہیں سکتا۔

اس میں تیسری خرابی یہ ہے کہ غالب قومیت کے اندر اگر نسلی اور مذہبی عصبیت پوری طرح جڑ پکڑے ہوئے ہوتی ہے تو وہ وطنی قومیت کا روپ دھارن کر کے بھی دوسرے شریکوں کے مقابل میں اجتماعی و سیاسی زندگی کے ہر گوشے میں اپنے مفاد اور اپنے رنگ کو غالب رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسرے اگر اپنے حقوق کا نام لیں، اپنی زبان کا ذکر کریں، اپنی تہذیب کا رونا روئیں، اپنے مذہب کا حوالہ دیں تو اس کو گروہی تعصب، انتشار پسندی اور ملک و وطن کے ساتھ غداری پر محمول کیا جاتا ہے لیکن شریک غالب دھڑلے کے ساتھ ساری چیرہ دستیاں کرتا ہے لیکن مجال نہیں ہے کسی کی کہ اس کے خلاف زبان ہلا سکے۔ اس صورت حال کی بہترین مثال بھارت کی ہندو اکثریت کا طرز عمل ہے۔

اس کی چوتھی خرابی یہ ہے کہ بعض حالات میں شریک غالب بھی اس میں شدید نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب شریک غالب عددی اکثریت تو رکھتا ہو لیکن اس کے اندر وحدت اور تنظیم نہ ہو، معاشی اعتبار سے وہ بدحال اور سیاسی اعتبار سے وہ غیر منظم ہو، اس کے لیڈر سادہ لوح یا ابن الوقت ہوں، اس کے اندر محض مفاد اور اغراض کے لیے بہت سی پارٹیاں بن گئی ہوں جس سے اس کی سیاسی طاقت بالکل منتشر ہو گئی ہو اور یہ پارٹیاں محض وقتی مفاد اور حصول اقتدار کے لیے اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے سودا بازیاں کر سکتی ہوں۔ ایسی صورت میں عددی اکثریت رکھنے کے باوجود وہ کسی حوصلہ مند اور منظم اقلیت کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کے رہ جاتی ہے۔ یہ اقلیت اپنی ہوشیاری اور سیاسی جوڑ توڑ سے اس کی پارٹیوں کو اپنا آلۂ کار بنا لیتی ہے اور جو مقاصد وہ خود اپنے ہاتھوں پورے کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی وہ ان کے واسطے سے بڑی آسانی سے پورے کر لیتی ہے۔ اس میں بڑی سہولت اس کو اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس کو انتخابات میں شریک غالب کے نمائندوں کے انتخابات پر بھی اثر انداز ہونے کا موقع مل جائے۔ اس کی نہایت واضح مثال مشرقی پاکستان نے پیش کی۔ یہاں مسلمان عددی اکثریت رکھنے کے باوجود اپنی مذکورہ بالا کمزوریوں کے سبب سے ہندوؤں کے لیے ایک چراگاہ بنتے جا رہے تھے۔ اور اس علاقے میں مخلوط طریقۂ انتخاب رائج ہو جانے کے بعد اقلیت کے اکثریت پر اثر انداز

ہونے کے مواقع اس قدر بڑھ گئے تھے کہ اکثریت نہ صرف تہذیب و تمدن اور مذہب کے اعتبار سے سخت نقصان اٹھا رہی تھی بلکہ ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ ملک کی سالمیت ہی خطرے میں پڑ جائے۔

اس کی پانچویں خرابی اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ قومیت خطرات و مشکلات کے مقابل میں عموماً بہت بودی ثابت ہوتی ہے۔ وطنی عصبیت کا جذبہ ابھارنے کے لیے اگر کوئی محرک سب سے زیادہ قوی ہو سکتا ہے تو وہ کسی مشترک مصیبت کا ظہور یا اس کے ظہور کا خطرہ ہی ہو سکتا ہے لیکن یہ مشترک مصیبت بھی ایک وطنی قومیت کے مختلف عناصر میں اتحاد کا عام ولولہ اور حب وطن کا عام جوش صرف اسی صورت میں پیدا کرتی ہے جب قومیت کے تمام اجزا اپنے آپ کو وطن کے تمام ذہنی و مادی فوائد میں برابر کا شریک و سہیم سمجھتے ہوں۔ اگر یہ صورت نہ ہو (اور اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس صورت کا پیدا ہونا صرف خاص حالات ہی میں ممکن ہے) تو جو اجزائے قومیت اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے ہیں وہ اس مشترک مصیبت کو ایک مصیبت سمجھنے کے بجائے بعض حالات میں اس کو اپنے لیے رحمت سمجھتے ہیں اور ایسے مواقع پر ان کی ہمدردیاں اپنے وطنی ہم قوموں کے بجائے بیرونی حملہ آوروں ہی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ بیرونی حملہ آور اگر زیرک ہوں تو وہ کسی ملک کے اس اندرونی اضطراب سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر اتحادیوں نے جو یہ نعرہ لگایا تھا کہ یہ جنگ مظلوم و مقہور اقلیتوں کی آزادی کے لیے لڑی جا رہی ہے اس نعرے سے انھوں نے اپنے حریفوں کے مقابل میں بڑا فائدہ اٹھایا، اگرچہ اس سے فائدہ اٹھا چکنے کے بعد انھوں نے خود اس کی پوری بے حرمتی کی۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ وطن کی اساس پر بنی ہوئی قومیت اپنے اصل مدعا کے اعتبار سے تو بودی اور پھسپھسی ہوتی ہے البتہ ففتھ کالم یا اسلامی اصطلاح میں منافقین کی پرورش کے لیے یہ بہترین پناہ گاہ فراہم کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر قومیت کے تمام عناصر کو بالکل مساوی درجہ میں آسودہ اور مطمئن کیا جا سکے تو اس خرابی کو دور کیا جا سکتا ہے لیکن یہ خرابی خود وطنی قومیت کی تعمیر ہی میں مضمر ہے اس وجہ سے اس کو دور کرنا بہت مشکل ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے مذکورہ عوامل پر تنقید

اب آئیے اسلام کی روشنی میں مذکورہ عوامل پر غور کیجیے کہ وہ ان کو کس حد تک رد اور کس حد تک قبول کرتا ہے۔

اسلام ان تمام عوامل قومیت کو نہ تو یک قلم رد ہی کرتا ہے اور نہ ان کو پورا کا پورا قبول ہی کرتا ہے۔ عوامل میں سے جو عامل جس حد تک عقل اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے اس کو اس نے نہ صرف اختیار کرلیا ہے بلکہ اس کو جزو دین بنا دیا ہے جس کو نہ صرف ماننا ضروری ہے بلکہ اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ لیکن جہاں کہیں عقل اور فطرت کے حدود سے ان میں کوئی انحراف یا تجاوز ہے اسلام نے واضح الفاظ میں اس کی نشان دہی کردی ہے کہ یہ انحراف یا تجاوز حدود اللہ سے تجاوز ہے اور اس سے معاشرہ اور قومیت میں فساد کو راہ ملتی ہے جس کا اثر بالآخر سارے نظام زندگی پر پڑتا ہے۔

اسلام میں نسل و نسب کا درجہ اسلام نسل و نسب کے رابطہ کو ایک نہایت قوی رابطہ تسلیم کرتا ہے۔ اس کو خاندان اور معاشرہ کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ رشتۂ رحم کاٹنے کو ایک گناہِ عظیم اور فساد فی الارض کا سبب بتاتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کو تنگ نظریوں اور تعصبات کے شر سے پاک رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل حقائق بھی سامنے رکھ دیتا ہے۔

ایک یہ کہ تمام انسان ایک ہی خدا کی مخلوق اور ایک ہی آدم و حوا کی اولاد ہیں اس وجہ سے حقوق اگرچہ الاقرب فالاقرب کے اصول پر قائم ہیں لیکن اپنے خاندان یا اپنی قوم و قبیلہ کو حق و باطل کا معیار نہیں بنالینا چاہیے اور اس کے تعصب میں اندھے ہو کر انصاف اور سچائی کے بالاتر اصولوں سے منحرف نہیں ہوجانا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ خاندانوں اور قبیلوں کی تمیز اور زبان اور رنگ کی تفریق محض شناخت اور تعارف کے لیے ہے، یہ نہ عزت اور شرافت کی کوئی کسوٹی ہے اور نہ خدا سے تقرب و وصل کی کوئی دلیل۔ خدا کی نظر میں درجہ اور مرتبہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کی شریعت اور اس کے قانون کا احترام کرنے والے ہیں اور یہی لوگ ایک اسلامی معاشرہ میں بھی حقیقی عزت و احترام کے مستحق ہیں۔

تیسرا یہ کہ اجتماعی و سیاسی زندگی کے لیے صرف وہی ضوابط صحیح ہیں جو انسانی فطرت کے مطابق خود انسانوں کے خالق نے بنائے ہیں نہ کہ وہ جو قومی و قبائلی عصبیت کے تحت خود انسانوں نے ایجاد کیے ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق قرآن و حدیث میں مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے بیان ہوئے ہیں۔ ہم چند آیتوں اور حدیثوں کے ترجمے یہاں درج کرتے ہیں:-

"اے لوگو! اپنے اس خداوند سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو بھی پیدا کیا۔ پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پھیلائیں اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے ہو اور رحمی رشتوں کا احترام کرو۔ اللہ تم پر نگہبان ہے" (سورۂ نساء آیت ۱)

یہ آیت ان بنیادی اصولوں کو واضح کر رہی ہے جن پر اسلامی معاشرہ (یا بالفاظ دیگر اسلامی قومیت) قائم ہے۔ اس میں دو چیزوں کو باہمی ہمدردی اور باہمی تعاون و تناصر کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ ایک خدا کو جو سب کا خالق ہے اور ایک رشتۂ رحم کو، جس کا شعور اگرچہ ایک خاص حد سے آگے جا کر مضمحل ہوجاتا ہے لیکن فی الحقیقت وہ تمام نسلِ انسانی کے درمیان مشترک ہے۔ علاوہ ازیں عورت کو بھی اس معاشرہ میں برابر کا شریک ٹھیرایا گیا ہے اگرچہ اپنے فرائض کے اعتبار سے اس کا دایرہ مردوں کے دائرے سے الگ ہے۔

دوسری آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور ہم نے تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے کہ یہ چیز تمہارے لیے تعارف کا ذریعہ ہو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ با عزت وہ ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ اللہ علم و خبر رکھنے والا ہے" (حجرات، ۱۳)

حدیث میں رشتۂ رحم کی اہمیت ملاحظہ ہو:

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کو پیدا کیا، یہاں تک کہ جب ان کو پیدا کرکے فارغ ہوا تو رحم کھڑا ہوا اور اس نے عرشِ الٰہی کو تھام کر کہا کہ یہ جگہ ہے اس کی جو قطع رحم سے تیری پناہ چاہے؟ ارشاد باری ہوا ہاں۔ کیا تو

اس بات پر راضی نہیں ہے کہ میں اس سے جوڑوں جو تجھ سے جوڑے اور اس سے کاٹوں جو تجھ سے کاٹے ؟ بولا ، میں اس پر راضی ہوں ۔ ارشاد باری ہوا کہ یہ مقام تجھ کو بخشا گیا ۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو (یعنی اس آیت سے اس مضمون کی تائید ہو جائے گی) فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ [۱] (ریاض الصالحین بحوالہ مسلم و بخاری)

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ قطع رحم یا قطع قرابت اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی پاداش میں قطع رحم کرنے والوں پر لعنت کر دیتا ہے اور ان کے دلوں دماغوں کو اندھا بہرا کر دیتا ہے ۔

زبان و ادب کی حیثیت

اسلام معاشرہ کی تشکیل میں زبان و ادب کے مرتبہ اور اس کی اجتماعی و سیاسی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن اس کو بھی مجرد قومی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے اخلاقی معیاروں پر جانچ کر اس کے سلیم و سقیم اور خبیث و طیب میں فرق کرتا ہے ۔ یہ نہیں ہے کہ قومی زبان اور قومی ادب کے نام سے رطب و یابس اور پاک و ناپاک کا جو انبار بھی اکٹھا کر دیا جائے وہ سب کا سب بلا کسی فرق و امتیاز کے یکساں عزت و احترام کے لائق قرار دے دیا جائے اور اس پورے کی حفاظت و صیانت اور اس سارے کی نقل و روایت ایک قومی فریضہ سمجھ لی جائے ۔ حد یہ ہے کہ لاکھوں روپے دیہاتوں کے گیتوں اور ان کے قصوں کہانیوں کے جمع کرنے ، ان کو مرتب کرنے اور پھر ان کو لوگوں کے ذہنوں پر لادنے پر ضائع کر دیئے جائیں ۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں جیسا کہ عرض کیا گیا بالکل عقلی و اخلاقی ہے ۔ وہ صرف اسی ادب کو ادب قرار دیتا ہے جو صحیح منبع سے نکلا ہو اور جو ذہنوں کو صحیح غذا دینے والا اور طبیعتوں کو صحیح رُخ پر ڈالنے والا ہو ۔ اگر محض ادبی اور قومی نقطۂ نگاہ سے اس معاملے کو دیکھا جائے تو حالی و اقبال کے ادب اور امانت لکھنوی اور زہر عشق کے مصنف کے ادب دونوں

۱؎ پس تم سے یہی متوقع ہے ، اگر تم منہ موڑے رہو ، کہ تم زمین میں فساد مچاؤ اور رشتہ رحم کو کاٹو ۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کے کان بہرے کر دیے اور ان کی آنکھیں اندھی کر دیں (محمد : ۲۲)

کے لیے احترام کے الگ الگ پہلو نکل سکتے ہیں لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو امانت اور شوق کے ادب کو ادب میں جگہ دینے کے بجائے عیب کی طرح چھپانا پڑے گا ۔

امرؤ القیس کو عرب میں ایک قومی شاعر ہونے کے لحاظ سے اشعر الشعراء کا بلند مقام حاصل تھا ، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں فرمایا کہ اشعر الشعراء وقائدهم الى النار کہ یہ تمام شاعروں کا امام اور ان کو جہنم کی طرف لے جانے والا ہے ۔ اگر حضورؐ بھی اس کو محض قومی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تو اس کو اشعر الشعراء ہی قرار دیتے لیکن آپؐ کا نقطۂ نگاہ اخلاقی بھی تھا اس وجہ سے آپؐ نے ایک ایسے شاعر کے سارے ذخیرۂ ادبی کو رد کر دیا جس نے عرب کے قومی ادب کو اگرچہ سب سے قیمتی سرمایہ دیا تھا لیکن ساتھ ہی بے حیائی اور فحاشی میں بھی آپ اپنی مثال تھا ۔ اس کے برعکس آپؐ نے دوسرے اسلامی شاعروں کے کلام سنے اور ان کی تحسین فرمائی ۔ زمانۂ جاہلیت کے بعض شاعروں اور خطیبوں کے کلام کی بھی آپؐ نے تعریف فرمائی ۔ بعض خطیبوں کے متعلق تو یہاں تک ارشاد ہوا کہ یہ حقیقت کے بہت قریب پہنچ گئے تھے لیکن حقیقت کو پا نہ سکے ۔ حضرت عمرؓ مشہور جاہلی شاعر زہیر کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے ، اور وجہ یہی تھی کہ اس کے کلام میں امرؤ القیس کی سی رندی و ہوسناکی نہیں ہے بلکہ نہایت گہری حکمت کی باتیں ہوتی ہیں اور ایسی خوبی کے ساتھ کہتا ہے کہ دل میں اترتی چلی جاتی ہیں ۔ یہ باتیں اس امر کا نہایت واضح ثبوت ہیں کہ اسلام میں قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے زبان و ادب کو ایک جگہ حاصل تو ہے لیکن صرف پاکیزہ ادب کو حاصل ہے ۔ ہر ہرزہ سرائی کو اسلام یہ جگہ نہیں دیتا ۔

تہذیب اور روایات

اسلام قومیت کی تشکیل میں تہذیب اور روایات کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن جس طرح وہ زبان و ادب کو اخلاق کی کسوٹی پر جانچ کر اس کے صالح عنصر کو اپناتا اور فاسد کو رد کر دیتا ہے اسی طرح وہ قومی تہذیب کے مظاہر اور قومی روایات کو بھی اخلاق کی کسوٹی پر جانچتا ہے اور اس جانچ کے بعد ان کا جو حصہ منکر ثابت ہو جاتا ہے اس کو تو رد کر دیتا ہے اور جو معروف ہوتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے ۔ قرآن کو پڑھیے تو آپ کے سامنے بار بار یہ بات آئے گی کہ فلاں بات معروف کے مطابق کرو ۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس معاملے میں قومی دستور اسلام کی نظر میں پسندیدہ تھا جس کے سبب سے اسلام نے اس کی

اسی قدر عزت بڑھائی کہ اس کو خود اپنا ایک حصہ بنا لیا۔ برعکس اس کے قومی رسوم و عادات یا تہذیب و روایات میں جو باتیں اخلاق کے اصول کے منافی یا حقیقت کے خلاف تھیں ان کو منکر قرار دے کر رد کردیا۔ اسی طرح عرب کے تاریخی اشخاص میں سے لقمان اور ان کے فرزند کا نہایت اچھے انداز میں قرآن نے ذکر کیا ہے بلکہ پوری قوم کے بڑھوں اور نوجوانوں کے سامنے ان کو ایک لائق باپ اور ایک لائق فرزند کی مثال کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کی حکیمانہ نصیحتوں کا رتبہ تو اتنا بڑھایا ہے کہ وحی الٰہی نے ان کو خود قرآن کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔ یہ لقمان عرب کے حکماء میں سے صرف ایک حکیم تھے کوئی پیغمبر نہیں تھے۔ ان کے پیغمبر ہونے کا کوئی ثبوت کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن نے ذوالقرنین کا ذکر ایک عادل اور خدا ترس حکمران کی حیثیت سے کیا ہے حالانکہ وہ ایک غیر قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ ان چیزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام تہذیب اور روایات کو متعصبانہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے حق پرستانہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا خود اپنا ایک معیار ہے جس پر جانچ کر وہ ایک چیز کو رد یا قبول کرتا ہے اور یہ معیار اخلاق اور عقل ہے نہ کہ قومی۔ قومی نقطۂ نگاہ تو ان معاملات میں بسا اوقات اتنا متعصبانہ ہوجاتا ہے کہ اس تعصب کے اندھے فرعون کو محض اس دلیل پر اپنا لیڈر مان لیں گے کہ وہ ان کی اپنی قوم سے تھا اگرچہ وہ نہایت مستبد اور ظالم تھا اور اس کے ظلم و استبداد ہی کے سبب سے اس کی پوری قوم عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئی۔ اور حضرت موسیٰؑ کو محض اس بنا پر رد کردیں گے کہ وہ نسلاً دوسری قوم سے تعلق رکھتے تھے اگرچہ وہ عدل و انصاف کے پیکر تھے اور ان کے ہاتھوں مظلوموں کو نجات ملی۔

اسلام کی نظر میں وطن کی حیثیت

اسلام وطن کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی مسلمان اگر اپنے وطن کی حفاظت کی راہ میں مارا جائے تو اس کی موت شہادت کی موت ہے لیکن وطن کی اس اہمیت کے باوجود اسلام نے وطن کو بھی حق کے اصولوں کے تابع ہی رکھا ہے، اس کو حق سے بالاتر نہیں قرار دیا ہے۔ اسلام کی نظر میں انسان کی اصل قدر و قیمت اس کے ایک عقلی و اخلاقی ہستی ہونے کی ہے نہ کہ کسی خاص رقبہ زمین کے باشندہ ہونے کی۔ اس وجہ سے وہ اس کے عقلی و اخلاقی مطالبات اور تقاضوں کو دوسرے تمام مطالبات اور علائق پر مقدم رکھتا ہے۔ اگر کسی مرحلے میں عقل اور اخلاق کے مطالبات اور وطن کے

مطالبات میں تصادم واقع ہوجائے تو اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ آدمی عقل و اخلاق کے مطالبات کا ساتھ دے، وطن کے مطالبات کو نظر انداز کردے۔ اگر ایک سرزمین پر آدمی اپنے اخلاقی و ایمانی تقاضوں کو پورا نہ کرسکتا ہو بلکہ وہ مجبور ہوتا ہو کہ وہ جس نظریہ حیات پر ایمان رکھتا ہے اس سے دست بردار ہو، جن اخلاقی ضوابط کا پابند ہے ان کو نظر انداز کرے اور جن حدود کی نگہداشت وہ اپنے فرائض میں سمجھتا ہے ان کو توڑے تو اس سرزمین کے ساتھ محض اس وجہ سے اس کا بندھے رہنا کہ وہاں سے اس کو پیٹ پالنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر ہے اس کی انسانیت کی توہین ہے۔ ایک سچا مسلمان ایسی حالت میں دو ہی راہیں اختیار کرسکتا ہے یا تو اس کی اصلاح کے لیے اپنا پورا زور لگائے اور اس کو اس قابل بنائے کہ اپنے دین و ایمان کے ساتھ وہاں زندگی بسر کرسکے اور اگر وہ یہ نہیں کرسکتا تو پھر دوسری راہ یہ ہے کہ وہ اپنے دین و ایمان کو لے کر وہاں سے کسی ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر جائے جہاں زندگی کے دوسرے عیش چاہے حاصل نہ ہوں لیکن دین و ایمان کی آزادی حاصل ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو عجب نہیں کہ وہ ایک مخالف ماحول میں ایمان کی نعمت ہی سے محروم ہوجائے۔ قرآن مجید کی ایک آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

"جن لوگوں کو فرشتے اس حال میں موت دیتے ہیں کہ وہ (دارالکفر میں پڑے رہنے کے سبب سے) اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ فرشتے ان سے پوچھتے ہیں تم کس حال میں پڑے رہے؟ وہ کہتے ہیں ہم اپنے وطن میں بے بس اور مقہور تھے۔ فرشتے ان سے کہتے ہیں کیا خدا کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ وہی لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور برا ٹھکانا ہے۔" (۹۷، نساء)

مذہب

اسلام مذہب کو قومیت کی تشکیل میں سب سے زیادہ موثر اور سب سے زیادہ قوی عامل مانتا ہے لیکن اگر مذہب کی بنیاد شرک پر ہو یا قومی تعصبات کے تحت اس میں حق و انصاف کے فطری اصولوں کو بالکل مسخ کردیا گیا ہو، یا وہ حقیقی فرائض اور واقعی حقوق کی تعلیم دینے کے بجائے صرف عوام کی خواہشوں کا ایک مجموعہ بن کے رہ گیا ہو تو ایسے مذہب کو اسلام نہ تو صحیح مذہب مانتا اور نہ اس طرح کے کسی مذہب پر قائم ہونے والی قومیت کو صحیح قومیت تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح کے مذہب میں وہ سارے مفاسد موجود ہوتے ہیں جو نسل و نسب اور زبان اور رنگ سے بنی ہوئی قومیتوں کے اندر ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ دنیا کے مشرکانہ مذاہب جتنے

اگر تجزیہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایجادیں اس لیے کیے گئے ہیں کہ وہ اپنے پیروؤں کے قومی تعصبات اور ان کی قومی امنگوں کو اشیر باد دیں۔ یہودی مذہب اگرچہ اپنی اصل کے لحاظ سے مشرکانہ مذہب نہیں ہے بلکہ ایک آسمانی مذہب ہے لیکن بنی اسرائیل نے جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں، اس میں طرح طرح کی تحریفات کر کے اس کو ایک خدائی مذہب کے بجائے اس کو اپنا ایک قومی مذہب بنا ڈالا۔ مذاہب کے اندر یہ فساد پیدا ہو جانے کے سبب سے اسلام ان میں سے کسی کو بھی اس لائق نہیں سمجھتا کہ وہ ایک صحیح المزاج قومیت کی بنیاد بن سکے۔ (باقی)

بقیہ "تقریظ و تنقید"

رسالہ "اسباق النحو" لکھا۔ اس رسالہ میں نحو کا وسیع مفہوم لیا گیا ہے جس میں صرف بھی شامل ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے صرف و نحو کی قدیم کتابوں سے اختلاف کر کے اعراب کی بنیاد عوامل کی بجائے اختلافِ حالات پر رکھ کر مضمون کو آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں اس رسالہ میں منطقی تعریفات سے عموماً اجتناب کر کے اپنی بات کو مثالوں سے واضح کیا ہے، جس سے ایک مبتدی تعریفات کے الجھاؤ میں نہیں پڑنے پاتا۔ یہ کتاب ہندوستان کی کئی درسگاہوں کے نصاب میں داخل ہے اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اس کے سائنٹفک طریقہ سے طالب علم صرف و نحو کے اصول بہت جلد سمجھ لیتے ہیں۔

ہمارے پیش نظر کتاب کے حصہ اول کا تیسرا ایڈیشن ہے جس میں صرف اسم کا بیان ہوا ہے۔ اس ایڈیشن کی طباعت عمدہ کاغذ پر ہوئی ہے۔ پچھلے ایڈیشنوں میں مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اضافے شامل نہیں تھے اور بعض مثالوں کی جگہیں خالی چھوڑی ہوئی تھیں۔ اس ایڈیشن میں تمام اضافے شامل کر دیے گئے ہیں اور خالی جگہوں کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم نے بھر دیا ہے، لہٰذا یہ کتاب اب مکمل ہو گئی ہے۔ ہم عربی مدارس اور عربی کے طلبہ کے لیے اس کتاب کو مفید سمجھتے اور اس کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ (خ۔م)

خط و کتابت کرتے وقت پتہ صاف اور خوشخط تحریر کریں

تقریظ و تنقید

مقالاتِ سیرت

تالیف:- ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم۔ اے، پی، ایچ۔ ڈی

صفحات:- ۲۸۰ ۔ قیمت: چار روپے آٹھ آنے

شائع کردہ:- مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام حال ہی میں اس احساس کے ساتھ قائم ہوئی ہے کہ اسلام سے انحراف اور مادہ پرستی کے اس دور میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے سب سے موثر طریقہ جو ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اسلام کے اصول و قوانین سے آگاہ کرنے اور ان کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں جو شکوک و شبہات ہیں، ان کے ازالہ کے لیے عربی، اردو، انگریزی اور ہندی زبانوں میں سنجیدہ علمی کتابیں شائع کی جائیں۔ اس مجلس کی صدارت مولانا ابوالحسن علی ندوی جیسی معتمد علیہ شخصیت کے حصے میں آئی ہے اور اس کے ارکان میں ڈاکٹر محمد آصف قدوائی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور مولانا محمد رابع ندوی جیسے معروف لوگ ہیں۔ مجلس جس عزم و حوصلہ کے ساتھ قائم ہوئی ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مجلس کو اپنے نیک عزائم میں کامیاب کرے، اس کی کوششوں کو اپنے دین کی نصرت کا ذریعہ بنائے اور اس کے کارکنان و معاونین کو دنیا و آخرت میں ان کے خلوص کا اجر عطا فرمائے۔

اس مجلس نے اپنے سلسلہ مطبوعات کا آغاز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت جیسی مبارک چیز کی اشاعت سے کیا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ پر صدیوں سے کتابیں لکھی جا رہی ہیں، لیکن یہ موضوع ہی کچھ ایسا ہے کہ عصری تقاضوں کے تحت اس پر بار بار لکھنے کی ضرورت باقی

رہتی ہے۔ مولانا شبلیؒ کی سیرۃ النبی اور قاضی سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمینؐ اردو زبان میں سیرت کے موضوع پر اس قدر جامع تصنیفات ہیں کہ انھوں نے کسی بھی دوسری تصنیف سے وقتی طور پر بے نیاز کر دیا ہے۔ لیکن ان دونوں کتابوں کی ضخامت کے پیش نظر ان سے استفادہ چونکہ اس دور میں ایک مشکل کام ہے، اس لیے متعدد اہل علم نے مختصر سیرتیں مرتب کی ہیں۔ زیر نظر کتاب 'مقالات سیرت' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ فاضل مولف نے اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے استقصاء کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ سیرت کے بعض اہم پہلوؤں پر آٹھ مقالات لکھے ہیں جن میں مستشرقین کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا جواب دے کر حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مقالات کے آخر میں تین ضمیمے ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند خطبات، دعائیں اور احادیث درج کی گئی ہیں۔

مقالات کے موضوعات بہت اہم ہیں مثلاً اسلام میں نبوت کا تصور، حیات طیبہ، معجزے، خلقِ عظیم، پیغمبر اسلام اور تلوار، کامیاب ترین پیغمبر وغیرہ۔ پہلا مقالہ نہایت جامعیت کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ اسلام میں نبوت کا تصور کیا ہے۔ چونکہ مولف نے اس مقالہ کو قرآن مجید کی آیات سے مدلل کیا ہے، اس لیے ہمارا اندازہ ہے کہ یہ بہت سے ذہنوں سے غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کامیاب ہوگا۔ معجزات اور جہاد کے تصور پر مستشرقین کے پھیلائے ہوئے اعتراضات پر جاندار بحث کی گئی ہے۔ کامیاب ترین پیغمبر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کس طرح کامیاب رہے۔ آخری مقالہ 'سرور کائنات' میں مصنف نے دنیا کی سرداری کے قابل شخصیت کے لیے ایک معیار مقرر کر کے یہ دکھایا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس معیار پر کس طرح پورے اترتے ہیں۔ فاضل مصنف کا انداز تحریر پوری کتاب میں نہایت سنجیدہ اور علمی ہے۔ وہ دلائل و شواہد کے ساتھ اپنی بات پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے جابجا دوسرے اہل علم کی آراء اور ان کی کتابوں کے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں جس سے کتاب زیادہ دلچسپ ہوگئی ہے۔ زبان و انداز بیان شگفتہ ہے۔

کتاب کے مطالعہ کے دوران میں ہمیں اس میں بعض باتیں ایسی بھی نظر آئیں جو مولف کی نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ مثلاً حیات طیبہ کے دو مقالوں میں اگر آنحضرتؐ کی زندگی کے تمام اہم واقعات مختصر طور پر دے دیئے جاتے تو ایک قاری کے سامنے آنحضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا بیک وقت پورا خاکہ آجاتا اور واقعات کی مجمل تاریخ جاننے کے لیے اسے کسی دوسری کتاب کی طرف رجوع نہ کرنا پڑتا۔ معجزات پر جو مقالہ سپرد قلم کیا گیا ہے، اس کو زیادہ مدلل کرنے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں دو تین جگہ فاضل مولف کے نقطۂ نظر سے بھی ہمیں اختلاف ہے۔ مثلاً ان کا یہ نظریہ ہمارے نزدیک غلط فہمی پیدا کرے گا کہ "انبیاء صرف شارح تھے شارع نہیں۔ ان کا منصب اور کام خدا کے قانون کی تشریح اور وضاحت اور اس قانون کی روشنی میں لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا پیدا کرنا تھا، قانون وضع کرنا نہیں" (ص ۲۴) ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ بنیادی قانون اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس کی تشریح و توضیح فرمائی بلکہ اسی کی روشنی میں، اس کے تقاضوں کے مطابق اور خدا کی مرضی سے مزید قانون خود وضع فرمایا اور حلال و حرام کے ضابطے مقرر فرمائے۔ مسلمانوں کی زندگیوں میں جو قانون رائج ہے، اس کا بیشتر حصہ وہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وضع کیا ہوا ہے اور ہمارے لیے اسی طرح حجت ہے جس طرح خدا کا قانون۔ ہمارے نزدیک موجودہ دور میں یہ کہنا کہ انبیاء صرف شارح تھے، شارع نہیں' ایک عظیم خطرے کو دعوت دینا ہے۔ فاضل مصنف نے اپنے اس نظریہ پر جن آیات سے استدلال کیا ہے، ان کا مفہوم بالکل دوسرا ہے۔

اسی طرح ہجرت کے متعلق مصنف کا یہ نقطہ نظر ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ "مکہ سے وقتی طور پر مسلمانوں کا ہٹ جانا ایک دفاعی اقدام تھا تاکہ مدینہ میں اپنا ایک مرکز بنا سکیں، جہاں نہ قریش کی عظمت و اقتدار سے ٹکراؤ ہوتا تھا اور نہ خاندانی رقابتیں دین کی راہ میں رخنے ڈالتی تھیں" (ص ۸۰) ہمارے نزدیک انبیاء کرام کے ہجرت جیسے عظیم اقدام کو سیاسی پیمانوں سے ناپنا درست نہیں۔ اس سے ہمیں انکار نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے جہاں دوسرے

بے شمار نتائج ظاہر ہوئے، وہاں ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کو مدینہ میں اپنی طاقت مضبوط کرنے کا موقع ملا اور بالآخر انھوں نے اتنی قوت حاصل کی کہ مکہ فتح کر لیا۔ لیکن نبی کی ہجرت نہ کسی سیاسی مصلحت اندیشی پر مبنی ہوتی ہے اور نہ کسی جنگی چال پر، بلکہ نبی کی دعوت سے جب تمام سلیم الفطرت لوگ باطل سے اپنا ناطہ توڑ لیتے ہیں اور ہٹ دھرم مخالفین حق کو نیست و نابود کرنے کے لیے آخری بازی لگانے کو تیار ہو جاتے ہیں، اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور اس کے ساتھیوں کو ان ہٹ دھرم لوگوں سے علیحدہ ہو جانے کا حکم دے دیتا ہے۔ اس طرح ہجرت کا اقدام اتمام حجت کے بعد گویا اہل باطل سے اظہار بیزاری کا ہوتا ہے۔ ہجرت کے نتیجہ میں باطل کی تباہی یقینی ہو جاتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح جسم سے روح کے نکل جانے کے بعد اس کی موت یقینی ہوتی ہے۔

ان اسقام سے قطع نظر مجموعی اعتبار سے کتاب نہایت عمدہ ہے اور اس قابل ہے کہ اسے پڑھا اور پڑھایا جائے۔ کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے تحریر کیا ہے اور یہ اچھے کاغذ پر عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ جلد اور گرد پوش خوشنما ہے (خ۔م)

اسباق النحو (حصہ اول)

تصنیف: مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

صفحات:- ۵۶ ، **قیمت:-** ایک روپیہ

شائع کردہ:- دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ (انڈیا)

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:- ماہنامہ میثاق، رحمان پورہ۔ اچھرہ لاہور

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ صرف قرآن ہی پر نکتہ رس نگاہ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا موضوع فکر عربی زبان اور عربی ادب بھی تھا۔ عربی زبان کے قواعد پر وہ زبردست قدرت رکھتے تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ عربی صرف و نحو کی تعلیم کا رائج طریقہ ایک مبتدی کے لیے بہت پیچیدہ ہے اور اسے زیادہ سائنٹفک بنیادوں پر مرتب ہونا چاہیے۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

انتخاب فرمائیے

ترجمہ و تفسیر قرآن مجید	از مولانا محمود الحسن رح و مولانا شبیر احمد عثمانی رح	۱۶/۸/-
تفسیر احسن التفاسیر	جلد اول از مولانا سید احمد حسن محدث دہلوی	۱۱/-
تدبر قرآن	تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ از مولانا امین احسن اصلاحی	-/۱۲/-
تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد کی معرکۃ الآراء کتاب	۳/-
حضرت عمر رض کے سرکاری خطوط	مؤلفہ ڈاکٹر خورشید احمد فاروق ایم۔اے	۱۳/-
قادیانیت	مرزائیت کا نئے انداز سے تجزیہ از مولانا ابوالحسن علی	۸/-
سیرت سید احمد شہید	مصنفہ مولانا ابو الحسن علی ندوی	۸/۸/-
عمر فاروق رض	از محمد حسین ہیکل ترجمہ حبیب اشعر	۲۰/-
ابوبکر رض	از محمد حسین ہیکل ترجمہ شیخ محمد پانی پتی	۱۰/-
اشتراکی چین	از پروفیسر ارشاد احمد ایم۔اے	۵/-
تبرکات آزاد	مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ مرتبہ غلام رسول مہر	۶/۸/-
نقش آزاد	مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ مرتبہ غلام رسول مہر	۶/-
مولانا آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی	بروایت عبدالرزاق ملیح آبادی	۲/۸/-
پاکستان کا مستقبل	از سعید ملک	۳/-

دیگر علمی و ادبی نایاب و کمیاب کتب ملنے کا پتہ

المکتبۃ الرحمانیہ

۸-۱۳ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور